Urdu Studies
An international, peer-reviewed, bilingual research journal
ISSN: 2583-8784 (Online)
Vol. 6 │Issue 1 │Year 2026
Pages: 90-125

من، وجود اور خاموشی:
شبنم عشائی کی نظموں کی شعریات

عمر فرحت

Abstract. This paper examines the poetics of Dr. Shabnam Ashai's poetry focusing on Self, Existence and Silence. It argues that Ashai transforms silence from mere absence into a powerful poetic presence, where themes of self, loneliness, dreams and dust are symbolically interrelated. Her poems exhibit a closed inner structure and employ devices like ellipsis, semantic recurrence and non-linear movement to express existential concerns, making silence itself the most eloquent language of being.
Keywords. Shabnam Ashai, Contemporary Urdu Poetry, Feminist Urdu Poetry.

اردو نظم کی جدید روایت کا سنجیدہ مطالعہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ اس صنف کی ارتقائی تاریخ محض ہیئت کی تبدیلی کی تاریخ نہیں، بلکہ انسانی شعور کی بدلتی ہوئی صورتوں کی تاریخ بھی ہے۔ نظم نے اپنی ابتدائی صورتوں میں خارجی دنیا، اجتماعی تجربات اور سماجی مسائل کو اظہار کا وسیلہ بنایا، لیکن جدید دور میں اس کی توجہ بتدریج انسان کے داخلی وجود، اس کی خاموش کشمکش، شعور کی شکست و ریخت، یاد، تنہائی، شناخت اور معنی کے بحران کی طرف منتقل ہوتی گئی۔ چنانچہ جدید نظم کا اصل میدان خارج نہیں بلکہ وہ باطن ہے جہاں انسان اپنے آپ سے سب سے دشوار مکالمہ کرتا ہے۔ اسی تناظر میں شبنم عشائی کی نظموں کا مطالعہ ایک خاص اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ ان کی نظموں کو پہلی نظر میں ذاتی

ISSN: 2583-8784 (Online)
Formerly UGC-CARE Listed since October 2021
Published on October 23, 2026
http://www.urdustudies.in
https://creativecommons.org/licenses/by-nc-nd/4.0/

واردات، نسائی احساس یا مختصر نظموں کا مجموعہ سمجھ لینا آسان ہے، لیکن متن کے اندر اترتے ہی محسوس ہوتا ہے کہ ان کی اصل تخلیقی قوت کسی واقعے یا جذبے کے بیان میں نہیں بلکہ اس شعری نظام میں پوشیدہ ہے جو لفظ، خاموشی، حذف، علامت اور داخلی مکالمے کے باہمی ربط سے تشکیل پاتا ہے۔ ان کی نظم اپنے ظاہری حجم سے کہیں زیادہ وسیع معنوی کائنات رکھتی ہے۔

شبنم عشائی ان نظم نگاروں میں شامل ہیں جو قاری کو کسی طے شدہ مفہوم تک نہیں پہنچاتیں بلکہ اسے ایک ایسے تخلیقی عمل میں شریک کرتی ہیں جہاں معنی ہر نئی قرأت کے ساتھ دوبارہ تشکیل پاتے ہیں۔ ان کے ہاں نظم ایک بند متن نہیں بلکہ ایک زندہ متن ہے، جو اپنی داخلی ساخت کے باعث ہر سنجیدہ قاری کے ساتھ الگ مکالمہ قائم کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کا مطالعہ صرف موضوعات کی فہرست مرتب کر دینے سے ممکن نہیں، بلکہ اس کے علامتی نظام، اس کی داخلی ساخت، اس کے سکوت اور اس کی شعری منطق کو سمجھنا ضروری ہے۔

شبنم عشائی کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ وہ اظہار سے زیادہ انکشاف پر یقین رکھتی ہیں۔ وہ کسی تجربے کی تفصیل بیان نہیں کرتیں بلکہ اس کے اس لمحہ باطن کو گرفت میں لاتی ہیں جہاں تجربہ ابھی زبان میں پوری طرح منتقل نہیں ہوا ہوتا۔ ان کے ہاں نظم اکثر اسی مقام سے شروع ہوتی ہے جہاں عام شاعری ختم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں غیر کہی ہوئی باتیں، کہی ہوئی باتوں سے زیادہ اہم محسوس ہوتی ہیں۔ ان کی نظموں کو پڑھتے ہوئے بار بار احساس ہوتا ہے کہ شاعرہ لفظوں پر اعتماد ضرور کرتی ہیں، لیکن ان سے بھی زیادہ اعتماد لفظوں کے درمیان موجود وقفوں پر کرتی ہیں۔ یہ وقفے محض نحوی خاموشیاں نہیں بلکہ معنی کی وہ پوشیدہ سطحیں ہیں جہاں قاری کو خود اترنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری میں خاموشی اظہار کی ضد نہیں بلکہ اظہار کی تکمیل ہے۔ ان کے یہاں سکوت بھی ایک فعال شعری عنصر ہے، جو معنی کو محدود نہیں بلکہ وسیع کرتا ہے۔ ان کی نظموں کی قرأت سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ان کے یہاں چند بنیادی علامتیں پوری شعری کائنات کو منظم کرتی ہیں۔ من، وجود، خاموشی، تنہائی، مٹی، لفظ، روشنائی، گرد، رشتہ، لاتعلقی اور موت الگ الگ استعارے نہیں بلکہ ایک ہی فکری نظام کے مختلف مظاہر ہیں۔ ان میں سب سے مرکزی علامت

"من" ہے، جو صرف دل یا جذبے کا استعارہ نہیں رہتا بلکہ انسانی باطن، شعور، حافظہ، تخلیقی اضطراب اور وجودی شناخت کا مجموعی استعارہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح 'خاموشی' محض عدمِ کلام نہیں بلکہ ایک ایسی معنوی فضا ہے جس میں نظم اپنی اصل آواز حاصل کرتی ہے اور "وجود" صرف فلسفیانہ اصطلاح نہیں بلکہ مسلسل تشکیل پاتا ہوا انسانی باطن ہے۔

یہاں ایک اہم نکتہ یہ بھی ہے کہ شبنم عشائی کی نظموں کو صرف نسائی تجربے کے تناظر میں محدود کر دینا مناسب نہیں ہو گا۔ اگرچہ ان کی نظموں میں عورت کی داخلی اذیت، بے حیثیتی اور رشتوں کی شکست موجود ہے، لیکن یہ تجربات اپنی انفرادی سطح سے بلند ہو کر انسانی وجود کے وسیع تر سوالات میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ ان کی شاعری میں عورت ایک علامت بھی ہے مگر اس سے بڑھ کر انسان ایک بنیادی حقیقت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظمیں کسی مخصوص نظریاتی خانے میں مقید نہیں ہوتیں بلکہ اپنے داخلی صدق کی بنا پر آفاقی معنویت اختیار کر لیتی ہیں۔

شبنم عشائی کی مختصر نظمیں بھی خصوصی توجہ کی طالب ہیں۔ ان کے یہاں اختصار محض شعری حجم کی کمی نہیں بلکہ شعری کثافت کی علامت ہے۔ وہ چند سطروں میں ایسی فکری اور جمالیاتی فضا قائم کر دیتی ہیں جسے پوری طرح سمجھنے کے لیے بار بار متن کی طرف لوٹنا پڑتا ہے۔ ان کے ایک ایک مصرعے میں کئی غیر مرئی معنی پوشیدہ رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم پہلی قرأت میں مکمل طور پر منکشف نہیں ہوتی بلکہ ہر نئی قرأت اپنے ساتھ ایک نئی تعبیر لے کر آتی ہے۔ ان کی نظموں کی یہی تہہ داری اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کا مطالعہ تاثراتی انداز میں نہیں بلکہ ایک منظم شعری مطالعے کے طور پر کیا جائے۔ زیرِ نظر تحقیق بھی اسی مقصد کو سامنے رکھتی ہے۔ اس میں شبنم عشائی کی نظموں کو محض موضوعاتی تقسیم کے تحت نہیں دیکھا جائے گا بلکہ ان کے شعری نظام، علامتی ساخت، داخلی وحدت، وجودی شعور، خاموشی کی جمالیات، من کی علامت، تخلیقی اضطراب، زبان کی کفایت اور مختصر نظم کی شعریات کے تناظر میں سمجھنے کی کوشش کی جائے گی۔

شبنم عشائی کی اصل انفرادیت ان کے موضوعات میں نہیں بلکہ ان کے تخلیقی رویّے میں ہے۔ ان کے یہاں نظم واقعے کی نقل نہیں بلکہ باطن کی دریافت ہے، بیان کا عمل نہیں بلکہ معنی کی جستجو ہے،

جذبات کا اخراج نہیں بلکہ وجود کے ساتھ ایک مسلسل مکالمہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو سمجھنے کا راستہ براہِ راست الفاظ سے نہیں بلکہ ان علامتی اور خاموش دائروں سے ہو کر گزرتا ہے جہاں ان کی نظم اپنا حقیقی وجود حاصل کرتی ہے۔

اگر کسی شاعر یا شاعرہ کی شعری دنیا کو سمجھنے کے لیے اس کی بنیادی علامت دریافت کرلی جائے تو اس کی پوری تخلیقی ساخت نسبتاً زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ بڑی شاعری عموماً منتشر موضوعات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ ایک ایسے داخلی مرکز کے گرد تشکیل پاتی ہے جہاں مختلف تجربات، احساسات اور فکری رویّے آکر ایک وحدت اختیار کرلیتے ہیں۔ یہی داخلی مرکز شاعر/ شاعرہ کی انفرادی شناخت بھی بن جاتا ہے۔ شبنم عشائی کی نظموں کا بار بار اور گہرائی سے مطالعہ اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ ان کی پوری شعری کائنات ایک مرکزی علامت کے گرد گردش کرتی ہے، اور وہ علامت ''من'' ہے۔ بظاہر ''من'' ایک مانوس لفظ ہے۔ اردو، ہندی اور ہندوستانی تہذیبی روایت میں یہ لفظ صدیوں سے استعمال ہوتا آیا ہے مگر ہر شاعر اور شاعرہ اسے ایک ہی معنوی دائرے میں استعمال نہیں کرتا۔ کہیں یہ دل کا مترادف ہے، کہیں خواہش کا، کہیں روح کا اور کہیں صرف باطنی احساس کا۔ لیکن شبنم عشائی کے یہاں ''من'' ان تمام محدود معنوں سے آگے بڑھ کر ایک مکمل شعری نظام کی بنیاد بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں ''من'' محض ایک لفظ نہیں بلکہ ایک ایسا داخلی مقام ہے جہاں وجود، شعور، حافظہ، محبت، دکھ، خاموشی، تخلیق اور تنہائی ایک دوسرے سے مربوط ہو جاتے ہیں۔

یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ شبنم عشائی اپنی نظموں میں ''من'' کی کوئی نظری تعریف پیش نہیں کرتیں۔ وہ اسے کسی فلسفیانہ اصطلاح میں قید بھی نہیں کرتیں۔ اس کے باوجود ان کی نظموں کا مجموعی مطالعہ واضح کرتا ہے کہ ''من'' ان کے نزدیک انسان کی وہ داخلی سرزمین ہے جہاں زندگی کے تمام بنیادی تجربات وقوع پذیر ہوتے ہیں۔ خارجی دنیا کے واقعات اپنی اصل معنویت اسی وقت حاصل کرتے ہیں جب وہ ''من'' میں اتر کر ایک باطنی تجربہ بن جائیں۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری میں حقیقت کا اصل مرکز خارج نہیں بلکہ باطن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں ''من'' کبھی ساکن نہیں رہتا۔ وہ ہر نظم میں ایک نئی صورت اختیار کرتا ہے۔ کہیں وہ مسافر ہے، کہیں مٹی ہے، کہیں بچہ

ہے، کہیں شور ہے، کہیں خوابوں کی زمین ہے، کہیں دکھ کا مسکن ہے، کہیں تخلیق کی کوکھ ہے اور کہیں ایسی خاموش وادی جہاں الفاظ بھی داخل ہونے سے ہچکچاتے ہیں۔ اس مسلسل تغیر کے باعث "من" ایک جامد استعارہ نہیں رہتا بلکہ ایک زندہ، متحرک اور ارتقا پذیر علامت بن جاتا ہے۔ اسی علامتی حرکت کو سمجھنے کے لیے شبنم عشائی کی یہ نظم بنیادی اہمیت رکھتی ہے:

من مسافر ہے
جانے کن زمانوں کی
طراوت کھوجنے
ہر پل سفر میں رہتا ہے

یہ چند مصرعے شبنم عشائی کے پورے تخلیقی مزاج کا خلاصہ معلوم ہوتے ہیں۔ یہاں "من" کسی منزل تک پہنچنے والا مسافر نہیں بلکہ مسلسل سفر کی حالت میں موجود ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس سفر کی سمت خارجی نہیں بلکہ داخلی ہے۔ شاعرہ کسی جغرافیے، کسی شہر یا کسی راستے کا ذکر نہیں کرتیں بلکہ "زمانوں کی طراوت" کی تلاش کا ذکر کرتی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سفر وقت کے اندر، یاد کے اندر اور وجود کے اندر جاری ہے۔ "طراوت" کا لفظ بھی یہاں غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ صرف تازگی کا مفہوم نہیں رکھتا بلکہ ایک ایسی گم شدہ معنویت کی علامت ہے جسے جدید انسان مسلسل تلاش کرتا ہے مگر پوری طرح پا نہیں سکتا۔ اس طرح "من" کی مسافرت دراصل وجود کی مسافرت بن جاتی ہے۔ یہ وہ داخلی جستجو ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتی، کیونکہ اس کی منزل کسی جغرافیے میں نہیں بلکہ خود انسان کے اندر پوشیدہ ہے۔ اسی علامتی نظام کی دوسری جہت اس نظم میں سامنے آتی ہے:

تم بار بار
جینے کی خاطر
میری من کی مٹی میں
موت کیوں بوتے ہو؟

یہاں "من" پہلی بار "مٹی" کی صورت اختیار کرتا ہے۔ مٹی عام طور پر نمو، زرخیزی اور تخلیق کی علامت سمجھی جاتی ہے، لیکن شاعرہ اسی مٹی میں "موت" بوئے جانے کی بات کرتی ہیں۔ یہ تضاد محض شعری حسن پیدا کرنے کے لیے نہیں بلکہ پوری نظم کی فکری بنیاد ہے۔ مٹی زندگی کا استعارہ ہے اور موت فنا، کا مگر شاعرہ دونوں کو ایک ہی علامتی فضا میں جمع کر دیتی ہیں۔ یہاں "من" تخلیق کی ایسی سرزمین بن جاتا ہے جس پر دکھ بھی اگتا ہے اور نظم بھی۔ اس لیے یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ شبنم عشائی کے نزدیک تخلیق، آسودگی سے نہیں بلکہ داخلی شکست سے جنم لیتی ہے۔ اسی نظم کا اگلا مصرع، ان کی پوری شعری فکر کا بنیادی مقدمہ معلوم ہوتا ہے۔

جو مٹی تخلیق کا دکھ
سہتی ہے
بانجھ نہیں ہوتی

تخلیق یہاں انعام نہیں بلکہ اذیت کا ثمر ہے۔ جس "من" نے دکھ برداشت نہیں کیا، وہ تخلیقی اعتبار سے زرخیز بھی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح "من" محض احساس کا مقام نہیں رہتا بلکہ تخلیق کی اصل کوکھ بن جاتا ہے۔

شبنم عشائی کی نظموں میں "من" کا ایک اور روپ محبت کے حوالے سے سامنے آتا ہے، لیکن یہ محبت بھی روایتی رومانی شاعری کی محبت نہیں۔ وہ لکھتی ہیں:

پر من پگلا ہے
بچے جیسے روتا ہے
محبت پہننا چاہتا ہے

یہاں "محبت پہننا" ایک غیر معمولی استعاراتی ترکیب ہے۔ محبت کوئی لباس نہیں، مگر شاعرہ اسے پہننے کی خواہش ظاہر کرتی ہیں۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک محبت کوئی خارجی تعلق نہیں بلکہ ایک داخلی کیفیت ہے، جسے انسان اپنے وجود کا حصہ بنانا چاہتا ہے۔ مگر یہی نظم آگے چل کر اس خواہش کی ناپائیداری بھی ظاہر کر دیتی ہے۔

اس طرح "من" حقیقت سے آگاہ بھی ہے اور خواب سے دستبردار بھی نہیں ہوتا۔ یہی داخلی تضاد ان کی شاعری کو زندگی بخشتا ہے۔ اگر "من" صرف حقیقت کو قبول کرلے تو تخلیق ختم ہو جائے اور اگر صرف خواب میں رہے تو حقیقت سے رشتہ ٹوٹ جائے۔ شبنم عشائی کی نظمیں انہی دو انتہاؤں کے درمیان ایک تخلیقی توازن قائم کرتی ہیں۔ اسی لیے ان کے یہاں "من" صرف محبت کا مرکز نہیں بلکہ یاد کا بھی مرکز ہے، خاموشی کا بھی، شکست کا بھی اور امید کا بھی۔ یہ ہر تجربے کو اپنے اندر جذب کرتا ہے مگر کسی ایک تجربے میں تحلیل نہیں ہوتا۔ یہی اس کی علامتی وسعت ہے۔ ایک اور نظم میں شبنم عشائی کہتی ہیں:

رشتے میرے من کی

اترن ہیں

یہ صرف دو مصرعے ہیں، لیکن ان میں شبنم عشائی کی علامتی قوت پوری شدت کے ساتھ سامنے آتی ہے۔ "اترن" کا لفظ عام طور پر استعمال شدہ لباس کے لیے آتا ہے، مگر شاعرہ نے اسے "من" کے ساتھ وابستہ کر کے رشتوں کی داخلی فرسودگی کا استعارہ بنا دیا ہے۔ گویا رشتہ پہلے "من" کا لباس تھا پھر وقت کے ساتھ اپنی حرارت اور تازگی کھو کر محض اترن بن گیا۔ اس ایک علامت میں انسانی تعلقات کی پوری نفسیات سمٹ آتی ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ شاعرہ رشتوں کا انکار نہیں کرتیں بلکہ ان کی باطنی معنویت پر سوال اٹھاتی ہیں۔ ان کے نزدیک وہ رشتہ زندہ نہیں رہتا جو "من" کو روشن نہ رکھ سکے۔ اسی لیے "من" ان کی شاعری میں اخلاقی اور وجودی پیمانہ بھی بن جاتا ہے۔ ہر تعلق، ہر خواب، ہر محبت اور ہر شکست کی اصل آزمائش اسی کے اندر ہوتی ہے۔

چنانچہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شبنم عشائی کی نظموں کو سمجھنے کی پہلی شرط "من" کی علامتی حیثیت کو سمجھنا ہے۔ اگر اس مرکزی استعارے کو نظر انداز کر دیا جائے تو ان کی بہت سی نظمیں منتشر احساسات کا مجموعہ محسوس ہوں گی، لیکن جب "من" کو ان کی پوری شعری ساخت کے مرکز میں رکھ کر پڑھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تمام نظمیں دراصل ایک ہی داخلی وجود کے مختلف مکالمے ہیں اور یہی داخلی وحدت ان کی شاعری کی سب سے بڑی فنی اور فکری کامیابی ہے۔

شبنم عشائی کی شاعری میں ”من“ کی علامت کو اگر صرف جذبے یا باطن کے استعارے تک محدود کر دیا جائے تو ان کے شعری نظام کی کئی اہم جہتیں نظروں سے اوجھل رہ جاتی ہیں۔ ان کی نظموں کا گہرا مطالعہ اس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتا ہے کہ ”من“ ایک ایسا داخلی مقام ہے جہاں وقت، یاد، خاموشی، دکھ، تخلیق اور وجود ایک دوسرے میں تحلیل ہو کر نئی معنویت پیدا کرتے ہیں۔ یہی داخلی امتزاج ان کی شاعری کو محض جذباتی اظہار سے بلند کر کے ایک منظم شعریات میں تبدیل کرتا ہے۔ ان کے یہاں ”من“ صرف احساسات کا ذخیرہ نہیں بلکہ حافظے کی وہ تہہ بھی ہے جہاں زندگی کے تمام گزرے ہوئے تجربات خاموشی سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ حافظہ تاریخ کی طرح واقعات کی ترتیب نہیں رکھتا بلکہ احساسات کی ترتیب رکھتا ہے۔ اس میں وقت تقویم کے مطابق نہیں گزرتا بلکہ دکھ، محبت، محرومی اور یاد کی شدت کے مطابق اپنی صورت بدلتا رہتا ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں ماضی کبھی مکمل طور پر ماضی نہیں بنتا، وہ مسلسل حال کے اندر زندہ رہتا ہے۔

یہی داخلی حافظہ ان کی شاعری میں ”خاموشی“ کو بھی ایک نئی معنوی جہت عطا کرتا ہے۔ عام طور پر خاموشی کو اظہار کی عدم موجودگی سمجھا جاتا ہے، لیکن شبنم عشائی کے یہاں خاموشی اظہار کی ضد نہیں بلکہ اس کی تکمیل ہے۔ وہ بہت سی ایسی باتیں نہیں کہتیں جنہیں ایک عام شاعر پوری تفصیل سے بیان کر دیتا، مگر یہی عدمِ بیان نظم کے سب سے مؤثر حصے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان کی نظم میں یہ کیفیت نہایت شدت سے سامنے آتی ہے:

من میں شور سا اٹھا
وہ سنتی تو
مر جاتی

یہ نظم اپنے ظاہری اختصار کے باوجود غیر معمولی معنوی وسعت رکھتی ہے۔ شاعرہ شور کا ذکر کرتی ہیں مگر اس شور کی کوئی آواز نہیں سنائی دیتی۔ وہ چیخ، فریاد یا احتجاج کی صورت اختیار نہیں کرتا بلکہ باطن کے اندر ہی گردش کرتا رہتا ہے۔ یہی داخلی شور دراصل شبنم عشائی کی شاعری کا اصل صوتی آہنگ ہے۔ یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر ”من“ میں شور موجود ہے تو شبنم عشائی کی نظموں میں

اتنا سکوت کیوں ہے؟ اس کا جواب یہی ہے کہ ان کے نزدیک شور اور خاموشی ایک دوسرے کی ضد نہیں بلکہ ایک ہی وجودی کیفیت کے دو مختلف مظاہر ہیں۔ باہر کی خاموشی دراصل اندر کے شور کا دوسرا نام ہے۔ جتنا گہرا اضطراب ہو گا، اتنی ہی گہری خاموشی پیدا ہو گی۔ اسی لیے ان کی نظموں میں سکوت کبھی خلا پیدا نہیں کرتا بلکہ معنی کو زیادہ مرتکز کر دیتا ہے۔

اسی داخلی سکوت کی ایک دوسری شکل ان نظموں میں سامنے آتی ہے جہاں شاعرہ سوال تو قائم کرتی ہیں مگر اس کا جواب دینے سے شعوری طور پر گریز کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر:

تم کہاں چھوڑ آئے ہو
تعلق ؟

یہ سوال محض کسی فرد سے نہیں بلکہ پورے عہد سے معلوم ہوتا ہے۔ شاعرہ نہ تعلق ٹوٹنے کی وجہ بیان کرتی ہیں، نہ اس کا کوئی منظر پیش کرتی ہیں اور نہ کسی کردار پر الزام عائد کرتی ہیں۔ وہ صرف ایک سوال پوچھتی ہیں۔ یہی سوال نظم کی اصل معنوی قوت بن جاتا ہے، کیونکہ اس کے بعد قاری اپنی زندگی، اپنے رشتوں اور اپنے تجربات کو اس سوال کے ساتھ جوڑنے لگتا ہے۔ یہی شبنم عشائی کی شعری تکنیک ہے۔ وہ جواب دینے کے بجائے سوال کو زندہ رکھتی ہیں، کیونکہ ان کے نزدیک بعض سوالات کا زندہ رہنا، ان کے جواب مل جانے سے زیادہ اہم ہوتا ہے۔

ان کی شاعری میں ”من“ کا ایک اور بنیادی تعلق تخلیق سے ہے۔ ان کے نزدیک نظم خارجی مشاہدے کا نتیجہ نہیں بلکہ داخلی مجبوری کا اظہار ہے۔ شاعرہ نظم نہیں لکھتیں بلکہ نظم ان سے لکھی جاتی ہے۔ یہی احساس اس نظم میں نمایاں ہے:

تم مجھ سے
اور کتنی نظمیں لکھواؤ گے ؟

یہ مختصر سوال شبنم عشائی کے پورے تخلیقی رویّے کو واضح کرتا ہے۔ یہاں شاعرہ تخلیق کو اختیار نہیں سمجھتیں بلکہ ایک ناگزیر داخلی تقاضا قرار دیتی ہیں۔ مخاطب کون ہے؟ زندگی، دکھ، تقدیر، محبت یا خود تخلیقی قوت؟

شاعرہ اس کی وضاحت نہیں کرتیں اور یہی غیر متعین مخاطب نظم کو علامتی وسعت عطا کرتا ہے۔اسی نظم کا اگلا حصہ ان کی تخلیقی فکر کو مزید واضح کرتا ہے:

دیکھو میں لفظ تراشتے تراشتے
لفظوں کی گرد میں
دفن ہو رہی ہوں

یہ استعارہ شبنم عشائی کی شاعری کی سب سے اہم تخلیقی دریافتوں میں شمار کیا جاسکتا ہے۔عام طور پر لفظ شاعر کی شناخت بناتے ہیں مگر یہاں لفظ ہی شاعرہ کے وجود کو آہستہ آہستہ تحلیل کر رہے ہیں۔'لفظوں کی گرد' محض ایک خوبصورت ترکیب نہیں بلکہ اس حقیقت کی علامت ہے کہ تخلیق کا ہر عمل اپنے خالق سے بھی ایک قیمت وصول کرتا ہے۔

یہاں ”من“ وہ مقام ہے جہاں تخلیق جنم بھی لیتی ہے اور تخلیق کار کو زخمی بھی کرتی ہے۔گویا شاعرہ کے نزدیک تخلیق کا عمل نجات کا راستہ بھی ہے اور اذیت کا وسیلہ بھی۔یہی دوہرا تعلق ان کی شاعری کو سطحی رومانویت سے محفوظ رکھتا ہے۔اسی تناظر میں ان کے یہ مصرعے بھی قابلِ توجہ ہیں:

جو مٹی تخلیق کا دکھ
سہتی ہو
بانجھ نہیں ہوتی

یہاں ”من“ کی مٹی صرف دکھ برداشت نہیں کرتی بلکہ اسی دکھ کو تخلیقی زرخیزی میں بدل دیتی ہے۔اس تصور میں ایک نہایت اہم شعری نکتہ پوشیدہ ہے۔شاعرہ کے نزدیک تخلیق دکھ کا نتیجہ ضرور ہے مگر وہ دکھ کی تکرار نہیں کرتی،وہ اسے نئی معنویت عطا کرتی ہے۔اس لیے ان کی نظموں میں کرب کبھی نوحہ نہیں بنتا بلکہ شعور میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

شبنم عشائی کے یہاں ”من“ کا تعلق حافظے سے بھی اسی لیے گہرا ہے کہ تخلیق دراصل یاد کی تہذیب کا عمل ہے۔شاعرہ ہر تجربے کو فوراً نظم میں تبدیل نہیں کرتیں۔تجربہ پہلے ”من“ میں اترتا ہے،خاموش ہوتا ہے،وقت گزارتا ہے،اپنی سطحیں بدلتا ہے اور پھر کسی مختصر مگر کثیف نظم کی صورت

اختیار کرتا ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں فوری ردِ عمل کم اور پختہ داخلی تجربہ زیادہ دکھائی دیتا ہے۔ یہی داخلی پختگی ان کے اختصار کی بھی بنیاد ہے۔ وہ اس وقت تک نظم مکمل نہیں کرتیں جب تک تجربہ اپنے غیر ضروری اجزا سے آزاد نہ ہو جائے۔ یوں ان کی مختصر نظم دراصل طویل داخلی ریاضت کا حاصل بن جاتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کا اختصار لفظوں کی کمی نہیں بلکہ تجربے کی تہذیب ہے۔

چنانچہ یہ کہنا درست ہو گا کہ شبنم عشائی کی نظموں میں 'من' ایک ساکت یا محدود علامت نہیں بلکہ ایک مسلسل فعال تخلیقی نظام ہے۔ وہ حافظہ بھی ہے، خاموشی بھی، تخلیق بھی، اذیت بھی اور وہ داخلی فضا بھی جہاں زندگی اپنے سب سے گہرے سوالات کے ساتھ موجود رہتی ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں "من" کو سمجھنا صرف ایک علامت کو سمجھنا نہیں بلکہ ان کی پوری شعری کائنات کی داخلی منطق کو دریافت کرنا ہے۔ یہی "من" ان کی شاعری کو وحدت، تسلسل اور فکری استحکام عطا کرتا ہے اور اسی کے گرد ان کا پورا شعری نظام اپنی معنوی گردش مکمل کرتا ہے۔ شبنم عشائی کی نظموں کا سنجیدہ مطالعہ اس مقام پر ایک نئے تنقیدی زاویے کا تقاضا کرتا ہے جہاں ان کی شاعری کو محض 'من' کی علامت کے دائرے سے آگے بڑھا کر "وجود" کے وسیع تر شعری تصور میں دیکھا جائے۔ اگرچہ "من" ان کی شعری کائنات کا داخلی مرکز ہے، لیکن یہ مرکز کسی محدود نفسیاتی کیفیت کی نمائندگی نہیں کرتا، بلکہ انسانی وجود کے ان پیچیدہ سوالات تک رسائی کا وسیلہ بنتا ہے جن سے جدید انسان مسلسل دوچار ہے۔ اس اعتبار سے شبنم عشائی کی شاعری کا اصل موضوع کوئی ایک جذبہ، کوئی ایک رشتہ یا کوئی ایک واقعہ نہیں، بلکہ خود وجود ہے؛ ایسا وجود جو اپنی شناخت، اپنی معنویت اور اپنی داخلی صداقت کی تلاش میں ہمیشہ حرکت پذیر رہتا ہے۔ ان کے یہاں وجود کسی فلسفیانہ اصطلاح کی صورت میں سامنے نہیں آتا۔ وہ وجود پر نظری بحث نہیں کرتیں، نہ اسے کسی مکتبہ فکر کے حوالے سے بیان کرتی ہیں، بلکہ اسے انسانی تجربے کی داخلی کیفیت کے طور پر محسوس کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں وجود ایک تصور سے زیادہ ایک زندہ تجربہ ہے۔ وہ اپنے باطن کی حرکت، اپنے احساس کی شکست، اپنی خاموشی کی تہوں اور اپنے لفظوں کی بے بسی کے ذریعے وجود کو دریافت کرتی ہیں۔ اس طرح ان کی شاعری میں وجود کوئی تجریدی تصور نہیں رہتا بلکہ ایک جیتی جاگتی شعری حقیقت بن جاتا ہے۔

شبنم عشائی کی نظموں کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں وجود کبھی مکمل، مستحکم یا مطمئن نہیں دکھائی دیتا۔ ان کا انسان ہمیشہ کسی نہ کسی کمی، کسی گمشدگی یا کسی ادھورے پن کے احساس کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔ یہی ادھوراپن ان کی تخلیق کا بنیادی محرک بھی ہے۔ اگر وجود مکمل ہو جائے تو سوال ختم ہو جائیں، اور جب سوال ختم ہو جائیں تو شاعری بھی اپنی داخلی ضرورت کھو بیٹھے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں تلاش، انتظار، خاموشی، یاد اور تنہائی بار بار سامنے آتے ہیں، یہ سب دراصل وجود کی نامکملی کے مختلف مظاہر ہیں۔ اس تناظر میں ان کی یہ نظم غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے:

وجود کے جو حصے
وجود کی تلاش میں کھو جاتے ہیں
ان کا اندراج
زندگی کی کسی بھی فائل میں نہیں ملتا

یہ مختصر نظم شبنم عشائی کی وجودی فکر کا نقطہ عروج محسوس ہوتی ہے۔ یہاں شاعرہ نے "زندگی" اور "وجود" کو ایک دوسرے کا مترادف نہیں سمجھا بلکہ ان کے درمیان ایک بنیادی امتیاز قائم کیا ہے۔ زندگی وہ ہے جسے معاشرہ دیکھتا، ناپتا اور درج کرتا ہے، لیکن وجود وہ ہے جو انسان کے اندر خاموشی سے تشکیل پاتا اور ٹوٹتا رہتا ہے۔ اسی لیے شاعرہ کہتی ہیں کہ وجود کے بعض حصے زندگی کی کسی فائل میں محفوظ نہیں ہوتے۔ "فائل" علامت یہاں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے۔ یہ جدید تہذیب کی نمائندہ علامت ہے، جہاں ہر چیز کا اندراج ممکن سمجھا جاتا ہے، مگر شاعرہ بتاتی ہیں کہ انسانی وجود کا سب سے حقیقی حصہ ہر قسم کی دستاویز سے باہر رہ جاتا ہے۔ اس ایک علامت سے وہ جدید انسان کی اس داخلی تنہائی کو آشکار کرتی ہیں جو تمام سماجی شناختوں کے باوجود محفوظ نہیں ہو پاتی۔ یہ نظم دراصل ایک بنیادی سوال قائم کرتی ہے۔ کیا انسان وہی ہے جو دنیا دیکھتی ہے یا وہ بھی جو اس کی نگاہ سے ہمیشہ اوجھل رہتا ہے؟ شبنم عشائی کی شاعری اس دوسرے وجود کی بازیافت کی شاعری ہے۔ ان کے نزدیک انسان کا اصل وجود وہ نہیں جو روزمرہ زندگی میں سرگرم ہے، بلکہ وہ ہے جو اپنے باطن کی خاموش تہوں میں مسلسل خود کو دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسی نظم کا اگلا حصہ اس تصور کو مزید گہرا کرتا ہے:

ہاں ان نظموں میں
جو آنسوؤں کی روشنائی سے
لکھی گئی ہوں
وہ حصے بستے ہیں

یہاں شبنم عشائی نظم کو محض ادبی اظہار نہیں بلکہ وجود کی بازیافت کا وسیلہ قرار دیتی ہیں۔ زندگی جن حصوں کو محفوظ نہیں رکھ سکتی، نظم انہیں اپنے اندر جگہ دیتی ہے۔ گویا نظم یادداشت نہیں، وجود کا متبادل مسکن بن جاتی ہے۔ یہ تصور شبنم عشائی کی شاعری میں نظم کی حیثیت کو محض جمالیاتی عمل سے بلند کر کے وجودی عمل میں تبدیل کر دیتا ہے۔

اسی مقام پر خاموشی کی معنویت بھی سامنے آتی ہے۔ شبنم عشائی کی شاعری میں خاموشی کبھی خالی جگہ نہیں بنتی، بلکہ وہ وجود کی سب سے گہری زبان ہے۔ انسان ہمیشہ اپنے سب سے اہم تجربات کو مکمل طور پر بیان نہیں کر سکتا۔ بعض دکھ، بعض محبتیں، بعض محرومیاں اور بعض خوف ایسے ہوتے ہیں جنہیں زبان پوری طرح اپنے اندر سمو نہیں سکتی۔ یہی وہ مقام ہے جہاں خاموشی بولنا شروع کرتی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں خاموشی عدمِ اظہار نہیں بلکہ اظہار کی آخری منزل ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ زبان کی اپنی حدود ہیں۔ لفظ کسی تجربے کا اشارہ تو دے سکتے ہیں، مگر اسے پوری طرح گرفت میں نہیں لے سکتے۔ چنانچہ وہ لفظوں سے زیادہ ان وقفوں پر اعتماد کرتی ہیں جو لفظوں کے درمیان موجود ہوتے ہیں۔ یہی وقفے نظم کی اصل معنوی فضا تشکیل دیتے ہیں۔

شبنم عشائی کی شاعری میں خاموشی کا تعلق صرف زبان سے نہیں بلکہ اخلاقی وقار سے بھی ہے۔ وہ اپنے دکھ کو شور میں تبدیل نہیں کرتیں، اپنی محرومی کو نوحہ نہیں بناتیں اور اپنے احتجاج کو نعرے میں نہیں ڈھالتیں۔ ان کے یہاں کرب ہمیشہ اپنی داخلی حرارت برقرار رکھتا ہے۔ یہی داخلی ضبط ان کی شاعری کو ایک خاص وقار عطا کرتا ہے۔ اس رویّے کی ایک نمایاں مثال ان کی یہ مختصر نظم ہے:

میں جینا نہیں چاہتی
کیونکہ

مجھے کچھ نہیں آتا

پہلی نظر میں یہ نظم ایک شخصی اعتراف معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کی ساخت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ شاعرہ نے اصل بات کہنے کے بجائے اسے شعوری طور پر حذف کر دیا ہے۔ سوال یہ نہیں کہ "کیا نہیں آتا؟" بلکہ یہی غیر مذکور حصہ نظم کی سب سے بڑی معنوی طاقت ہے۔ اگر شاعرہ اس کی وضاحت کر دیتیں تو نظم ایک محدود تجربے تک سمٹ جاتی، مگر حذف نے اسے آفاقی بنا دیا۔ اب ہر قاری اپنی زندگی کی ناکامی، اپنی بے بسی یا اپنی داخلی شکست کو اس نظم کے اندر دیکھ سکتا ہے۔

یہی حذف دراصل شبنم عشائی کی خاموشی کی شعریات کی بنیاد ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ ہر معنی کو مکمل طور پر بیان کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ بعض اوقات غیر کہی ہوئی بات زیادہ دیر تک قاری کے شعور میں زندہ رہتی ہے۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری میں خاموشی ایک فنی حربہ نہیں بلکہ شعری فکر کا بنیادی اصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کا مطالعہ ہمیں اس نتیجے تک پہنچاتا ہے کہ شبنم عشائی کے نزدیک شاعری کا مقصد کسی واقعے کی رپورٹ پیش کرنا نہیں بلکہ وجود کی ان تہوں کو منکشف کرنا ہے جو روزمرہ زبان میں کبھی پوری طرح سامنے نہیں آتیں۔ ان کے یہاں لفظ راستہ ہیں، منزل نہیں؛ اظہار وسیلہ ہے، مقصد نہیں اور خاموشی اختتام نہیں بلکہ معنی کی ابتدا ہے۔

اسی بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ شبنم عشائی کی شاعری میں وجود اور خاموشی دو الگ تصورات نہیں بلکہ ایک ہی داخلی تجربے کے دو رخ ہیں۔ وجود جتنا گہرا ہوتا جاتا ہے، خاموشی بھی اتنی ہی معنی خیز ہوتی جاتی ہے اور خاموشی جتنی گہری ہوتی ہے، وجود کی دریافت بھی اتنی ہی وسیع ہوتی جاتی ہے۔ یہی باہمی ربط ان کی شعری کائنات کو اس کی فکری وحدت اور جمالیاتی انفرادیت عطا کرتا ہے۔

اگر شبنم عشائی کی نظموں میں "من" داخلی وجود کا مرکز ہے تو "تنہائی" اس وجود کی سب سے بنیادی کیفیت ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں تنہائی صرف ایک نفسیاتی احساس نہیں، نہ ہی محض کسی شخص کی جدائی یا محرومی کا ردِ عمل ہے۔ وہ تنہائی کو ایک ایسی وجودی حالت میں تبدیل کر دیتی ہیں جس کے بغیر انسان اپنے باطن تک رسائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی لیے ان کی نظموں میں تنہائی کبھی صرف دکھ نہیں بنتی بلکہ خود شناسی کا وسیلہ بھی بن جاتی ہے۔

اس اعتبار سے ان کی شاعری میں تنہائی منفی کیفیت نہیں بلکہ ایک تخلیقی فضا ہے، جہاں وجود اپنی اصل آواز سنتا ہے۔ جدید اردو نظم میں تنہائی کا تصور مختلف صورتوں میں سامنے آیا ہے۔ کہیں یہ شہری زندگی کے بحران سے وابستہ ہے، کہیں تہذیبی شکست سے، کہیں محبت کی ناکامی سے اور کہیں فرد کی داخلی شکست سے۔ مگر شبنم عشائی کے یہاں تنہائی کی نوعیت مختلف ہے۔ ان کے یہاں تنہائی کسی بیرونی حادثے کا نتیجہ نہیں بلکہ وجود کی داخلی ساخت کا لازمی حصہ ہے۔ گویا انسان جتنا اپنے آپ کے قریب آتا ہے، اتنا ہی تنہائی کے گہرے احساس سے آشنا ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں تنہائی کبھی شور نہیں مچاتی بلکہ خاموشی کے ساتھ انسان کے اندر جگہ بنا لیتی ہے۔ وہ اپنے وجود کا اعلان نہیں کرتی بلکہ آہستہ آہستہ شعور کا حصہ بن جاتی ہے۔ یہی تدریجی کیفیت ان کی نظموں کو ایک خاص داخلی آہنگ عطا کرتی ہے۔

شبنم عشائی کی شاعری کا اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ داخلی کیفیات کو مجرد فلسفیانہ اصطلاحوں میں نہیں بلکہ روزمرہ کی علامتوں کے ذریعے مجسم کر دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم میں تنہائی کسی مجرد تصور کی صورت میں نہیں آتی بلکہ ایک زندہ وجود بن کر سامنے آتی ہے۔ وہ چلتی ہے، سوتی ہے، جاگتی ہے، انتظار کرتی ہے اور واپس آ جاتی ہے۔ اس طرح شاعرہ ایک نفسیاتی کیفیت کو علامتی کردار میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ یہی فنی رویہ ان کی نظموں کو داخلی ڈرامائیت عطا کرتا ہے۔ ان کی نظم:

میں
اور تنہائی
سو رہے تھے
تمہارا خط آیا

اپنے مختصر حجم کے باوجود ایک پورا داخلی منظر تشکیل دیتی ہے۔ یہاں تنہائی ایک کیفیت نہیں بلکہ ایک کردار ہے۔ خط کا آنا خارجی واقعہ ہے، مگر اس کا اثر خارجی دنیا پر نہیں بلکہ باطن کی خاموش دنیا پر مرتب ہوتا ہے۔ یہی داخلی تبدیلی اس نظم کی اصل فضا قائم کرتی ہے۔ یہاں قابلِ غور بات یہ ہے کہ شاعرہ خط کو خوشی کی علامت نہیں بناتیں۔

روایتی شاعری میں خط وصل یا امید کی علامت تھا، مگر شبنم عشائی کے یہاں وہ تنہائی کو بیدار کرنے والا واقعہ بن جاتا ہے۔ اس تبدیلی سے واضح ہوتا ہے کہ شاعرہ روایت کو دہراتی نہیں بلکہ اسے نئے وجودی تناظر میں برتتی ہیں۔ اسی نظم میں آگے چل کر جب وہ تنہائی کو جسمانی اوصاف عطا کرتی ہیں تو دراصل ایک نفسیاتی تجربے کو محسوس ہونے والی حقیقت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ اس طرح داخلی کیفیت قاری کے لیے ایک مرئی منظر اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شبنم عشائی کی علامت محض ذہنی تصور نہیں رہتی بلکہ ایک زندہ تجربہ بن جاتی ہے۔

ان کی شاعری میں خاموشی بھی اسی تنہائی کی توسیع ہے۔ مگر یہ خاموشی زبان کی ناکامی نہیں بلکہ زبان کی تکمیل ہے۔ شاعرہ جانتی ہیں کہ انسانی وجود کے بعض تجربات ایسے ہوتے ہیں جنھیں براہِ راست بیان کرنا ممکن نہیں۔ اس لیے وہ خاموشی کو اظہار کا حصہ بنا لیتی ہیں۔ ان کی نظموں میں غیر کہی ہوئی باتیں، کہی ہوئی باتوں سے زیادہ مؤثر محسوس ہوتی ہیں۔ اسی لیے ان کے ہاں سوال جواب سے زیادہ اہم ہے۔ جواب معنی کو بند کر دیتا ہے، جب کہ سوال معنی کو زندہ رکھتا ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں اسی لیے سوال پر ختم ہوتی ہیں یا ایسے مقام پر رک جاتی ہیں جہاں قاری کو خود معنی کی تکمیل کرنا پڑتی ہے۔ یہی فنی حکمت ان کی شاعری کو جامد مفہوم سے بچاتی ہے۔

شبنم عشائی کے یہاں خاموشی کا تعلق صرف زبان سے نہیں بلکہ رشتوں سے بھی ہے۔ ان کی نظموں میں بہت سے تعلقات بولتے ہوئے بھی خاموش ہیں اور بہت سی خاموشیاں گفتگو سے زیادہ بامعنی محسوس ہوتی ہیں۔ اس طرح وہ انسانی تعلقات کی اس داخلی سطح تک پہنچتی ہیں جہاں لفظ اپنی افادیت کھونے لگتے ہیں۔ اسی تناظر میں ان کے یہاں لاتعلقی ایک اہم علامت بن کر ابھرتی ہے۔ مگر لاتعلقی صرف رشتوں کا خاتمہ نہیں بلکہ معنی کے بتدریج زوال کا استعارہ ہے۔ تعلق اچانک نہیں ٹوٹتا؛ وہ آہستہ آہستہ خاموشی میں تحلیل ہوتا ہے۔ شاعرہ اس تدریجی تحلیل کو نہایت معمولی الفاظ میں بیان کرتی ہیں، مگر انھی معمولی الفاظ کے اندر انسانی تجربے کی غیر معمولی شدت پوشیدہ ہوتی ہے۔

شبنم عشائی کی نظموں میں رشتوں کی سب سے بڑی آزمائش یہی ہے کہ وہ باطن تک رسائی رکھتے ہیں یا نہیں۔ اگر تعلق صرف سماجی شناخت رہ جائے تو اس کی معنویت ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک

رشتہ صرف اس وقت زندہ ہے جب وہ انسان کے اندر روشنی پیدا کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں تعلق کی اصل بنیاد خارجی وابستگی نہیں بلکہ داخلی صداقت ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں محبت بھی کسی رومانوی کیفیت کے طور پر نہیں آتی بلکہ وجودی ضرورت بن کر سامنے آتی ہے۔ محبت انسان کو مکمل نہیں کرتی بلکہ اس کی نامکملی کو آشکار کرتی ہے۔ یہی احساس ان کی نظموں میں محبت کو جذباتی سطح سے بلند کر کے فکری سطح پر لے جاتا ہے۔

ان کی شاعری میں تنہائی، خاموشی اور محبت تین الگ الگ موضوعات نہیں بلکہ ایک ہی داخلی تجربے کی مختلف صورتیں ہیں۔ خاموشی تنہائی کو گہرا کرتی ہے، تنہائی محبت کی ضرورت پیدا کرتی ہے، اور محبت دوبارہ خاموشی میں تحلیل ہو جاتی ہے۔ یہی دورانیہ ان کی بیشتر نظموں کی داخلی ساخت تشکیل دیتا ہے۔

یہاں ایک اور اہم پہلو بھی قابلِ توجہ ہے۔ شبنم عشائی تنہائی کو کبھی شکست کی علامت نہیں بناتیں۔ ان کے یہاں تنہائی انسان کو توڑتی ضرور ہے، مگر اسی عمل میں اسے اپنے وجود سے بھی آشنا کرتی ہے۔ گویا خودشناسی کا سفر بھی تنہائی ہی سے شروع ہوتا ہے۔ یہی تصور ان کی شاعری کو محض غم کی شاعری بننے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو شبنم عشائی کی نظموں میں وجود کی اصل شناخت اجتماع میں نہیں بلکہ باطن کی خلوت میں تشکیل پاتی ہے۔ انسان جب دنیا کے شور سے الگ ہوتا ہے تب پہلی مرتبہ اپنے اندر کی آواز سنتا ہے۔ یہی اندر کی آواز ان کی شاعری کا اصل موضوع ہے، اور یہی خاموش آواز ان کی نظموں کی جمالیات کا بنیادی سرچشمہ بھی ہے۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ شبنم عشائی نے تنہائی کو محرومی کی علامت سے نکال کر وجودی آگہی کی علامت بنا دیا ہے۔ ان کی شاعری میں خاموشی عدمِ اظہار نہیں بلکہ معنی کی بلند ترین صورت ہے، اور تنہائی زندگی سے فرار نہیں بلکہ اپنے وجود کی بازیافت کا راستہ۔ یہی فکری جہت ان کی نظموں کو جدید اردو نظم میں ایک منفرد اور پائیدار مقام عطا کرتی ہے۔ میں یہ واضح کر چکا ہوں کہ شبنم عشائی کی شعری کائنات میں "من" داخلی وجود کی علامت ہے، جب کہ تنہائی اور خاموشی اس وجود کے تجربے کی بنیادی کیفیات ہیں۔ تاہم ان تمام عناصر کو الگ الگ دیکھنے سے ان کی شاعری کی اصل ساخت پوری طرح

منکشف نہیں ہوتی۔ ان کے درمیان جو داخلی ربط قائم ہے، وہی دراصل ان کی نظم کی شعریات (Poetics) تشکیل دیتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شبنم عشائی کی نظم ایک منتشر احساس یا انفرادی واردات نہیں رہتی بلکہ ایک مکمل تخلیقی نظام میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

شبنم عشائی کی نظموں کا سب سے اہم وصف یہ ہے کہ ان کے یہاں ہر نظم دوسری نظم سے مکالمہ کرتی ہے۔ اگر ان کی تمام نظموں کو الگ الگ پڑھا جائے تو وہ مختلف داخلی تجربات کا بیان محسوس ہوتی ہیں، لیکن جب انہیں مجموعی طور پر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی مسلسل شعری سفر کے مختلف مراحل ہیں۔ گویا شاعرہ پوری زندگی ایک ہی نظم لکھ رہی ہے، اور ہر نئی نظم اس طویل نظم کا ایک نیا باب ہے۔ یہی داخلی وحدت ان کی شاعری کو ایک منفرد شناخت عطا کرتی ہے۔

یہ وحدت کسی نظریاتی منشور یا موضوعاتی تکرار سے پیدا نہیں ہوتی بلکہ علامتوں کے باہمی ربط سے تشکیل پاتی ہے۔ من، وجود، تنہائی، خاموشی، موت، لفظ، مٹی، خواب، روشنائی اور گرد یہ سب الگ الگ علامتیں نہیں بلکہ ایک دوسرے کے معنی کو مکمل کرنے والے عناصر ہیں۔ اگر ان میں سے ایک علامت کو بھی اس کے داخلی نظام سے الگ کر دیا جائے تو نظم کی معنوی ساخت متاثر ہونے لگتی ہے۔ یہی علامتی باہمیت (Symbolic Interrelatedness) شبنم عشائی کی شعریات کا بنیادی اصول ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں کوئی علامت اپنے لغوی معنی پر قائم نہیں رہتی۔ ہر علامت اپنے سیاق میں ایک نئے وجود کی تشکیل کرتی ہے۔ مثال کے طور پر "لفظ" ان کے یہاں صرف اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ وجود کی بازیافت کا ذریعہ ہے۔ "خاموشی" گفتگو کی ضد نہیں بلکہ گفتگو کی تکمیل ہے۔ "گرد" فنا کی علامت ہونے کے باوجود تخلیق کی قیمت بھی بن جاتی ہے۔ 'مٹی' فنا کی علامت نہیں بلکہ تخلیقی زرخیزی کا استعارہ ہے۔ اس طرح ان کی شاعری میں اشیا اپنی مادی شناخت سے بلند ہو کر داخلی تجربے کی علامت بن جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ شبنم عشائی کی نظموں میں خارج کا وجود ہمیشہ باطن کے تابع رہتا ہے۔ خارجی اشیا کبھی اپنی مادی حقیقت کے ساتھ موجود نہیں ہوتیں بلکہ انسانی شعور میں داخل ہو کر اپنی نئی معنویت پیدا کرتی ہیں۔ ان کی نظموں میں دنیا وہ نہیں جو آنکھ دیکھتی ہے بلکہ وہ ہے جسے باطن محسوس کرتا ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں حقیقت ہمیشہ داخلی حقیقت کے طور پر سامنے آتی ہے۔

یہاں ایک نہایت اہم نکتہ سامنے آتا ہے۔ شبنم عشائی کی نظموں میں وجود کبھی مکمل نہیں ہوتا بلکہ ہمیشہ تشکیل کے عمل میں رہتا ہے۔ ان کے یہاں شناخت کوئی جامد شے نہیں بلکہ ایک مسلسل جستجو ہے۔ انسان اپنے وجود تک پہنچنے کی کوشش کرتا رہتا ہے، مگر ہر دریافت کے بعد ایک نئی کمی، ایک نئی تشنگی اور ایک نیا سوال اس کے سامنے آجاتا ہے۔ یہی ادھوراپن ان کی نظموں کو حرکت بخشتا ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں یقین سے زیادہ سوال اور جواب سے زیادہ تلاش موجود ہے۔ شاعرہ کسی حتمی صداقت کا اعلان نہیں کرتیں بلکہ انسانی وجود کی نامکملی کو قبول کرتی ہیں۔ ان کے نزدیک شاید یہی نامکملی تخلیق کی اصل بنیاد ہے۔ اگر تمام سوالوں کے جواب مل جائیں تو نہ جستجو باقی رہے گی اور نہ شاعری۔

شبنم عشائی کے تخلیقی رویے کا ایک اور نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ اظہار کے بجائے انکشاف پر یقین رکھتی ہیں۔ ان کی نظم کسی واقعے کی رپورٹ نہیں بلکہ کسی باطنی حقیقت کی تدریجی دریافت ہے۔ قاری جب نظم پڑھتا ہے تو وہ شاعرہ کے تجربے کو نہیں بلکہ اپنے ہی وجود کی کسی پوشیدہ سطح کو دریافت کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کامیاب نظمیں ہر سنجیدہ قاری کے لیے الگ معنی پیدا کر سکتی ہیں۔

ان کی نظموں میں "خاموشی" اسی انکشاف کا بنیادی وسیلہ ہے۔ "خاموشی" یہاں خالی جگہ نہیں بلکہ معنی کا وہ میدان ہے جہاں قاری کی شرکت سے متن مکمل ہوتا ہے۔ شاعرہ ہر بات نہیں کہتیں، وہ کچھ باتیں جان بوجھ کر چھوڑ دیتی ہیں۔ یہی حذف ان کی نظم کو وسعت دیتا ہے۔ ان کی شاعری کا ایک بڑا حصہ انہی غیر ملفوظ معنی پر قائم ہے۔ اسی تناظر میں شبنم عشائی کی مختصر نظموں کی اہمیت بھی سمجھ میں آتی ہے۔ ان کے یہاں اختصار، اظہار کی کمی نہیں بلکہ معنی کی کثافت ہے۔ وہ کم الفاظ میں زیادہ دنیا آباد کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مختصر نظم بھی ایک طویل نظم کی طرح دیر تک قاری کے ذہن میں متحرک رہتی ہے۔ ان کی نظم کا اختتام، دراصل اس کی معنوی ابتدا ہوتا ہے، کیونکہ اصل مکالمہ متن ختم ہونے کے بعد قاری کے اندر شروع ہوتا ہے۔ یہی خصوصیت ان کی نظموں کو وقتی تاثر سے بلند کر کے پائیدار ادبی تجربہ بناتی ہے۔ ایسی شاعری اپنی پہلی قرأت میں مکمل نہیں ہوتی۔ ہر نئی قرأت اس کے اندر سے ایک نئی تہہ دریافت کرتی ہے۔ اس اعتبار سے شبنم عشائی کی نظمیں ایک بار پڑھنے کی نہیں بلکہ بار بار پڑھنے کی شاعری ہیں۔

ان کی شعری کائنات کا ایک اور امتیاز یہ ہے کہ وہ اپنے داخلی تجربے کو کبھی خود ترحمی میں تبدیل نہیں کرتیں۔ ان کی نظموں میں دکھ ضرور ہے، لیکن شکست خوردگی نہیں؛ محرومی ہے، لیکن خود سپردگی نہیں؛ احتجاج ہے، مگر نعرہ نہیں۔ ان کا لہجہ ہمیشہ متوازن، باوقار اور اندر کی طرف متوجہ رہتا ہے۔ یہی وقار ان کی شاعری کو جذباتی افراط سے محفوظ رکھتا ہے۔

اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شبنم عشائی کی نظموں کی اصل شناخت کسی ایک موضوع یا کسی ایک علامت میں نہیں بلکہ ان کے تخلیقی رویے میں پوشیدہ ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں باطن کو محض موضوع نہیں بنایا بلکہ اسے اظہار کا بنیادی وسیلہ بھی بنایا ہے۔ ان کے یہاں نظم خارجی دنیا کی تصویر نہیں بلکہ داخلی وجود کی بازیافت کا عمل ہے۔ اسی لیے یہ کہنا زیادہ درست ہوگا کہ شبنم عشائی کی شاعری کو صرف نسائی شاعری، وجودی شاعری یا علامتی شاعری کے کسی ایک خانے میں محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی نظم ان تمام جہات سے مکالمہ ضرور کرتی ہے، مگر ان میں پوری طرح تحلیل نہیں ہوتی۔ ان کی اصل انفرادیت اس بات میں ہے کہ انھوں نے اپنے داخلی تجربے کو ایک ایسے شعری نظام میں ڈھال دیا ہے جس میں من، وجود اور خاموشی تین الگ اصطلاحیں نہیں رہتیں بلکہ ایک ہی تخلیقی تجربے کے مختلف مظاہر بن جاتی ہیں۔

شبنم عشائی کی نظموں کی اصل قوت ان کے موضوعات میں نہیں بلکہ اس شعری نظام میں مضمر ہے جس کے ذریعے وہ انسانی وجود کے پیچیدہ ترین تجربات کو نہایت سادہ مگر تہہ دار زبان میں بیان کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں خاموشی معنی پیدا کرتی ہے، علامت فکر کو وسعت دیتی ہے اور "من" انسانی وجود کی ایسی داخلی سرزمین بن جاتا ہے جہاں سے ہر نظم اپنی تخلیقی زندگی حاصل کرتی ہے۔ اسی فنی اور فکری وحدت کی بنا پر شبنم عشائی کی نظموں کو جدید اردو نظم میں ایک منفرد اور قابلِ اعتنا شعری تجربہ قرار دیا جا سکتا ہے، کیونکہ ان کے یہاں نظم محض لکھی نہیں جاتی، بلکہ انسانی وجود کے باطن میں آہستہ آہستہ وقوع پذیر ہوتی ہے۔

اب تک کی بحث میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ شبنم عشائی کی نظموں کی فکری اساس من، وجود اور خاموشی کے باہمی ربط سے تشکیل پاتی ہے۔ لیکن کسی شاعر کی تخلیقی انفرادیت صرف اس کے

موضوعات سے متعین نہیں ہوتی بلکہ اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ وہ ان موضوعات کو کس شعری ساخت، کس زبان اور کن فنی وسائل کے ذریعے اظہار عطا کرتا ہے۔ یہی وہ مرحلہ ہے جہاں شبنم عشائی کی شاعری کو محض موضوعاتی تنقید کے بجائے شعریات (Poetics) کے تناظر میں دیکھنا ضروری ہو جاتا ہے

بہت سے نقاد شاعری کا مطالعہ صرف اس بنیاد پر کرتے ہیں کہ شاعر نے کیا کہا ہے، حالاں کہ ایک سنجیدہ ادبی متن میں "کیسے کہا گیا ہے" کا سوال زیادہ بنیادی ہوتا ہے۔ ایک ہی تجربہ مختلف شعرا کے یہاں مختلف فنی صورتیں اختیار کرتا ہے، اور یہی فنی صورت اس تجربے کو انفرادی شناخت عطا کرتی ہے۔ شبنم عشائی کی نظموں کی اصل قوت بھی ان کے موضوعات سے زیادہ ان کے اسلوبِ اظہار میں پوشیدہ ہے۔ ان کے یہاں زبان محض اطلاع کا وسیلہ نہیں بلکہ معنی کی تخلیق کا بنیادی عنصر ہے۔ شبنم عشائی کی شاعری کی پہلی نمایاں خصوصیت اقتصادِ بیان ہے۔ وہ کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ معنوی وسعت پیدا کرتی ہیں۔ یہ اختصار محض لفظوں کی قلت نہیں بلکہ زبان پر غیر معمولی اعتماد کی علامت ہے۔ شاعرہ جانتی ہیں کہ کون سا لفظ کہا جائے اور کون سا لفظ خاموشی کے سپرد کر دیا جائے۔ اسی لیے ان کی اکثر نظمیں چند سطروں پر مشتمل ہونے کے باوجود ایک مکمل فکری تجربہ بن جاتی ہیں۔

مختصر نظم کا سب سے بڑا خطرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ محض ایک خیال یا تاثر بن کر رہ جائے، مگر شبنم عشائی اس خطرے سے محفوظ رہتی ہیں، کیونکہ ان کی مختصر نظم بھی اپنے اندر ایک مکمل داخلی ساخت رکھتی ہے۔ ان کے یہاں ہر نظم کا آغاز، ارتقا اور اختتام موجود ہوتا ہے، اگرچہ یہ سب چند مصرعوں میں سمٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم کو اس کے حجم سے نہیں بلکہ اس کی معنوی گہرائی سے پرکھنا چاہیے۔ یہ اختصار دراصل ان کے شعری اعتماد کا اظہار بھی ہے۔ وہ قاری پر اعتماد کرتی ہیں کہ وہ غیر کہے ہوئے معنی تک خود پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے وہ ہر نکتے کی وضاحت نہیں کرتیں، نہ ہر استعارے کی تشریح کرتی ہیں۔ ان کی شاعری میں حذف (Ellipsis) محض اسلوبی چال نہیں بلکہ ایک فکری رویہ ہے۔ وہ معنی کو مکمل طور پر قاری کے حوالے نہیں کرتیں، مگر اس کی تشکیل میں اسے شریک ضرور بنا لیتی ہیں۔

اسی تناظر میں ان کی شاعری کی دوسری بڑی خصوصیت علامتی زبان ہے۔ ان کے یہاں علامت کسی تجریدی مظاہرے یا مصنوعی پیچیدگی کا ذریعہ نہیں بنتی بلکہ انسانی تجربے کو زیادہ گہرائی کے ساتھ بیان کرنے کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ وہ علامت اس لیے نہیں برتتیں کہ نظم مشکل محسوس ہو بلکہ اس لیے کہ بعض داخلی تجربات کو براہِ راست زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی لیے ان کے یہاں من، مٹی، گرد، فائل، غبارہ، روشنائی، پھلن، چشمہ، بنجر زمین اور بستر جیسے الفاظ اپنی لغوی حیثیت سے آگے بڑھ کر علامتی وجود اختیار کر لیتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان کی بیشتر علامتیں روزمرہ زندگی سے لی گئی ہیں۔ وہ دور افتادہ اساطیر یا پیچیدہ ثقافتی حوالوں کا سہارا نہیں لیتیں بلکہ عام اشیا کو نئی معنویت عطا کرتی ہیں۔ یہی ان کی علامتوں کی تازگی ہے۔

شبنم عشائی کے یہاں علامت جامد نہیں بلکہ متحرک ہے۔ ایک ہی علامت مختلف نظموں میں مختلف معنی پیدا کرتی ہے۔ مثال کے طور پر 'من' کبھی دکھ کی زمین ہے، کبھی محبت کا مسکن، کبھی تخلیق کا سرچشمہ، کبھی تنہائی کا گھر اور کبھی وجود کی مکمل علامت۔ یہی مسلسل معنوی ارتقا اس علامت کو زندہ رکھتا ہے۔ اگر ہر جگہ اس کا ایک ہی مفہوم ہوتا تو وہ استعارہ نہیں بلکہ محض اصطلاح بن کر رہ جاتی۔

ان کی زبان کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ غیر خطابی (Non-Rhetorical) ہے۔ وہ قاری کو متاثر کرنے کے لیے بلند آہنگ جملے یا لفظی آرائش استعمال نہیں کرتیں۔ ان کی زبان آہستہ آہستہ اپنے معنی کھولتی ہے۔ اس میں شور نہیں بلکہ داخلی ارتعاش ہے۔ یہی خاموش آہنگ ان کی نظموں کی جمالیات کا بنیادی جزو ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جذبات کی شدت کے باوجود اظہار میں اعتدال برقرار رہتا ہے۔ وہ نہ جذباتی ابال پیدا کرتی ہیں اور نہ فکری خطابت۔ ان کی نظموں میں سب سے شدید تجربہ بھی نہایت سادہ لہجے میں بیان ہوتا ہے۔ یہی سادگی ان کے کلام کو وقار عطا کرتی ہے۔ شبنم عشائی کے اسلوب میں تکرار بھی قابلِ توجہ ہے، لیکن یہ لفظی تکرار نہیں بلکہ معنوی مراجعت (Semantic Recurrence) ہے۔ ان کی شاعری میں چند بنیادی الفاظ بار بار آتے ہیں، مگر ہر مرتبہ نئے سیاق اور نئی معنویت کے ساتھ۔ اس تکرار سے یکسانیت پیدا نہیں ہوتی بلکہ پوری شعری کائنات ایک داخلی وحدت اختیار کر لیتی ہے۔

یہ بھی اہم ہے کہ ان کے یہاں زبان کبھی معنی پر غالب نہیں آتی۔ بعض شاعروں کے ہاں اسلوب اپنی چمک سے معنی کو پس منظر میں دھکیل دیتا ہے، مگر شبنم عشائی کے یہاں زبان ہمیشہ معنی کی خدمت کرتی ہے۔ وہ لفظوں کو نمایاں نہیں کرتیں بلکہ لفظوں کے ذریعے تجربے کو نمایاں کرتی ہیں۔ یہی ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں فنی مہارت کا احساس براہِ راست نہیں ہوتا۔ قاری کو محسوس نہیں ہوتا کہ شاعرہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔ یہ بے ساختگی دراصل طویل تخلیقی ریاضت کا نتیجہ ہے۔ بڑی شاعری ہمیشہ اپنے فن کو چھپا لیتی ہے، اور شبنم عشائی کی نظموں میں بھی یہی وصف نمایاں دکھائی دیتا ہے۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شبنم عشائی کی شعری زبان تین بنیادی خصوصیات پر قائم ہے۔ اختصار، علامت اور خاموشی۔ یہی تینوں عناصر مل کر ان کی نظم کی فنی ساخت تشکیل دیتے ہیں۔ ان کے یہاں اختصار معنی کو مرتکز کرتا ہے، علامت اسے وسعت عطا کرتی ہے، اور خاموشی اسے دیرپا بناتی ہے۔ یہی تین جہات ان کی شاعری کو محض اظہار کا وسیلہ نہیں بلکہ ایک مکمل جمالیاتی تجربہ بنا دیتی ہیں۔

شبنم عشائی کی نظموں کی فنی ساخت کا ایک ایسا پہلو بھی ہے جس پر ابھی تک سنجیدگی سے گفتگو کم ہوئی ہے، حالاں کہ یہی عنصر ان کی شاعری کو اپنے عہد کی دوسری نظموں سے ممتاز کرتا ہے۔ یہ پہلو بے عنوان نظموں کی جمالیات ہے۔ بظاہر نظم کو عنوان نہ دینا ایک سادہ فنی فیصلہ محسوس ہوتا ہے، لیکن شبنم عشائی کے یہاں یہ محض ایک ظاہری اسلوب نہیں بلکہ ایک گہرا تخلیقی رویہ ہے۔ ان کی بیشتر نظمیں عنوان سے محروم ہیں، مگر یہی محرومی ان کی معنوی وسعت کا سبب بن جاتی ہے۔ بے عنوانی ان کی نظموں کو تکثیری معنویت عطا کرتی ہے۔ ایک ہی نظم مختلف قارئین کے لیے مختلف مفاہیم پیدا کر سکتی ہے اور ایک ہی قاری مختلف اوقات میں اسی نظم سے مختلف معنی اخذ کر سکتا ہے۔ اس طرح متن کبھی جامد نہیں ہوتا بلکہ ہر نئی قرأت کے ساتھ از سرِ نو تشکیل پاتا ہے۔ شبنم عشائی کی نظموں کی یہی خصوصیت انہیں بار بار پڑھے جانے کے قابل بناتی ہے۔ ان کی شاعری میں معنی پہلے سے موجود کسی شے کی دریافت نہیں بلکہ قرأت کے عمل میں پیدا ہونے والا تجربہ ہے۔ شاعرہ اپنے متن کو مکمل نہیں کرتیں، وہ اس کا ایک حصہ قاری کے شعور کے لیے محفوظ چھوڑ دیتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں میں غیر ملفوظ معنی اکثر ملفوظ معنی سے زیادہ اہم ہو جاتے ہیں۔ یہی رویہ ان کی مختصر نظموں میں بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ کسی خیال کی تفصیل بیان نہیں کرتیں بلکہ اس کا مرکزی لمحہ پیش کر دیتی ہیں۔ باقی فکری سفر قاری خود طے کرتا ہے۔ اس اعتبار سے شبنم عشائی کی نظم ایک بند ساخت (Closed Structure) نہیں بلکہ ایک کھلا تخلیقی نظام ہے، جس میں قاری محض وصول کنندہ نہیں بلکہ شریکِ تخلیق بن جاتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ شبنم عشائی قاری کو آسانی فراہم کرنے والی شاعرہ نہیں ہیں۔ ان کی نظمیں فوری مفہوم نہیں دیتیں، کیونکہ ان کی شعری دنیا ابلاغ سے زیادہ انکشاف پر قائم ہے۔ پہلی قرأت میں نظم کا ظاہری مفہوم سامنے آتا ہے، مگر دوسری اور تیسری قرأت میں اس کی علامتی تہیں اور خاموش اشارے منکشف ہونا شروع ہوتے ہیں۔ یہی تدریجی انکشاف ان کی شاعری کی جمالیات کا بنیادی وصف ہے۔ اس تناظر میں ان کی شاعری کو محض "مشکل شاعری" قرار دینا درست نہیں ہوگا۔ ان کی مشکل زبان کی نہیں بلکہ تجربے کی ہے۔ ان کے الفاظ عام ہیں، تراکیب سادہ ہیں، جملے مختصر ہیں، مگر ان کے اندر جو وجودی اور علامتی گہرائی پوشیدہ ہے، وہ سنجیدہ توجہ کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس لیے ان کی شاعری میں دشواری مصنوعی نہیں بلکہ تخلیقی ہے۔

شبنم عشائی کی نظموں کا ایک اور اہم پہلو خاموشی کی ساخت ہے۔ ان کے یہاں خاموشی صرف موضوع نہیں بلکہ اسلوب بھی ہے۔ وہ بہت سی باتیں کہہ کر نہیں بلکہ چھوڑ کر بیان کرتی ہیں۔ یہی حذف ان کی نظم کو وسعت دیتا ہے۔ قاری جب نظم مکمل کر لیتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ اصل گفتگو ابھی باقی ہے۔ یہی احساس ان کی شاعری کو دیرپا بناتا ہے۔ یہ خاموشی نظم کی رفتار کو بھی متعین کرتی ہے۔ ان کے یہاں مصرعے جلدی جلدی آگے نہیں بڑھتے بلکہ وقفوں کے ساتھ اپنا اثر پیدا کرتے ہیں۔ ہر سطر کے بعد ایک داخلی سکوت قائم ہوتا ہے، اور یہی سکوت اگلی سطر کے معنی کو زیادہ گہرا کر دیتا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاعرہ الفاظ سے کم اور وقفوں سے زیادہ گفتگو کر رہی ہیں۔

شبنم عشائی کی شعری ساخت میں ایک اور قابلِ توجہ عنصر غیر خطی ترتیب (Non-linear Movement) ہے۔ ان کی بہت سی نظمیں کسی واقعے کی ابتدا، وسط اور اختتام کے

روایتی بیانیے پر قائم نہیں ہوتیں۔ وہ کسی ایک داخلی لمحے سے آغاز کرتی ہیں، اسی لمحے کے گرد اپنے معنی مرتب کرتی ہیں اور اسی پر ختم ہو جاتی ہیں۔ مگر یہ اختتام بھی حتمی نہیں ہوتا بلکہ ایک نئے سوال کی ابتدا بن جاتا ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں زمانی ترتیب (Chronology) سے زیادہ داخلی زمانیّت اہم ہوتی ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل ایک ہی لمحہ شعور میں جمع ہو جاتے ہیں۔ یاد، خواب، احساس اور حالیہ تجربہ ایک دوسرے میں اس طرح مدغم ہوتے ہیں کہ نظم کسی ایک وقت کی نمائندہ نہیں رہتی بلکہ انسانی شعور کے مسلسل بہاؤ کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

ان کی نظموں کا یہ فنی رویہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ شاعرہ کے نزدیک حقیقت کوئی خارجی شے نہیں بلکہ شعور میں تشکیل پانے والا تجربہ ہے۔ اس لیے ان کی نظم میں خارج ہمیشہ باطن کے تابع رہتا ہے۔ شہر، گھر، بستر، مٹی، خط، غبارہ یا فائل۔ یہ سب خارجی اشیا ہیں، مگر نظم میں داخل ہوتے ہی اپنی مادی شناخت سے بلند ہو کر داخلی تجربے کی علامت بن جاتی ہیں۔ یہی علامتی ساخت ان کی شاعری کو ایک مستقل داخلی وحدت عطا کرتی ہے۔ ان کی ہر نظم الگ ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے مربوط محسوس ہوتی ہے۔ ایک نظم میں ابھرنے والی علامت دوسری نظم میں نئے مفہوم کے ساتھ سامنے آتی ہے اور یوں پوری شعری کائنات ایک مربوط علامتی نظام میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اسی لیے شبنم عشائی کی شاعری کا مطالعہ محض منتخب نظموں کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اصل تخلیقی شناخت ان کی پوری شعری کائنات کے مجموعی مطالعے سے سامنے آتی ہے، جہاں ہر نظم دوسری نظم کی تشریح بھی کرتی ہے اور اس کی توسیع بھی۔

یوں کہا جا سکتا ہے کہ شبنم عشائی نے بے عنوان نظم، علامتی زبان، اختصار، خاموشی اور قاری کی فعال شرکت کو اس طرح باہم مربوط کیا ہے کہ ان کی نظم محض ادبی متن نہیں رہتی بلکہ ایک ایسا تخلیقی تجربہ بن جاتی ہے جو ہر نئی قرأت میں از سرِ نو وجود اختیار کرتا ہے۔ یہی ان کی شعریات کی اصل قوت ہے اور یہی ان کی نظموں کی دیرپا ادبی اہمیت کا بنیادی سبب بھی ہے۔

کسی شاعر یا شاعرہ کی ادبی حیثیت کا تعین صرف اس کے موضوعات یا اس کی چند کامیاب نظموں کی بنیاد پر نہیں کیا جا سکتا۔ اصل سوال یہ ہوتا ہے کہ اس نے اپنی شعری روایت میں کون سا ایسا تخلیقی

اضافہ کیا ہے جس کے بغیر اس روایت کی تفہیم نامکمل محسوس ہو۔ ہر اہم شاعر اپنے عہد کی ادبی روایت کا محض حصہ نہیں ہوتا بلکہ اس روایت کے اندر ایک نئی جہت بھی پیدا کرتا ہے۔ اسی معیار پر جب شبنم عشائی کی نظموں کو دیکھا جائے تو ان کی اہمیت صرف ایک حساس نظم نگار کی حیثیت سے نہیں رہتی، بلکہ وہ جدید اردو نظم کی داخلی روایت میں ایک منفرد تخلیقی آواز کے طور پر سامنے آتی ہیں۔

یہاں "انفراد" سے مراد محض مختلف ہونا نہیں ہے۔ ادب میں محض الگ دکھائی دینا کوئی بڑی قدر نہیں، کیونکہ مصنوعی انفراد بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ حقیقی انفراد وہ ہے جو شاعر کے داخلی تجربے، اس کی زبان، اس کے علامتی نظام اور اس کی شعری ساخت سے فطری طور پر پیدا ہو۔ شبنم عشائی کی شاعری کا امتیاز بھی اسی نوعیت کا ہے۔ انھوں نے نہ تو شعوری طور پر مشکل زبان اختیار کی، نہ روایت سے غیر ضروری بغاوت کی اور نہ ہی اظہار کے کسی فیشن کی پیروی کی؛ ان کی الگ شناخت ان کے مسلسل تخلیقی مزاج سے وجود میں آئی ہے۔

ان کی شاعری کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ انھوں نے داخلی تجربے کو صرف موضوع نہیں بنایا بلکہ شعری ساخت کا بنیادی اصول بنا دیا۔ جدید اردو نظم میں باطن کی طرف رجوع کی روایت پہلے سے موجود ہے، مگر شبنم عشائی کے یہاں یہ رجوع نفسیاتی تجزیے تک محدود نہیں رہتا بلکہ وجود کی ایک مستقل جستجو میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ان کی نظم میں باطن کوئی بند کمرہ نہیں بلکہ ایک ایسی مسلسل کشادگی ہے جس میں ہر دریافت کے بعد ایک نئی تشنگی جنم لیتی ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں کوئی حتمی نتیجہ نہیں ملتا۔ وہ کسی فلسفیانہ نظام کی توثیق نہیں کرتیں، نہ کسی نظریاتی صداقت کا اعلان کرتی ہیں۔ ان کے یہاں سوال ہمیشہ جواب سے زیادہ اہم رہتا ہے۔ یہی سوالی رویہ ان کی شاعری کو جامد فکر سے محفوظ رکھتا ہے اور اسے ہر نئی قرأت میں تازہ بنائے رکھتا ہے۔

شبنم عشائی کی شعری شخصیت کا دوسرا بڑا امتیاز ان کا مرکزی علامتی نظام ہے۔ بہت سے نظم نگار علامتیں استعمال کرتے ہیں، مگر ان کے ہاں علامتیں اکثر ایک نظم تک محدود رہتی ہیں۔ شبنم عشائی کے یہاں ایسا نہیں ہے۔ ان کی پوری شعری کائنات چند بنیادی علامتوں کے گرد منظم ہوتی ہے۔ من، وجود، خاموشی، تنہائی، لفظ، مٹی، خواب اور دکھ الگ الگ استعارے نہیں بلکہ ایک مربوط فکری نظام

کے اجزا ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر نئی نظم سابقہ نظموں کے ساتھ ایک داخلی مکالمہ قائم کرتی ہے۔ خصوصی طور پر "من" کی علامت ان کی سب سے بڑی تخلیقی دریافت قرار دی جا سکتی ہے۔ اردو شاعری میں یہ لفظ پہلے بھی استعمال ہوتا رہا ہے، لیکن شبنم عشائی نے اسے جس فکری تسلسل اور معنوی وسعت کے ساتھ برتا ہے، وہ اسے ان کی انفرادی شناخت بنا دیتا ہے۔ ان کے یہاں "من" صرف دل یا باطن کا مترادف نہیں بلکہ انسانی وجود کا وہ داخلی مرکز ہے جہاں یاد، خواب، محبت، اذیت، تخلیق، خاموشی اور شناخت ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ یہی مرکز ان کی شاعری کو وحدت عطا کرتا ہے۔

ان کی نظموں کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ اختصار کو اظہار کی تکمیل میں بدل دیتی ہیں۔ مختصر نظم اردو ادب میں پہلے بھی لکھی گئی، لیکن شبنم عشائی کے یہاں اختصار صرف شعری ہیئت نہیں بلکہ ایک فکری حکمتِ عملی ہے۔ وہ جانتی ہیں کہ ہر تجربہ اپنی پوری تفصیل کا متقاضی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات چند الفاظ ہی پورے وجودی تجربے کو سمیٹ لیتے ہیں۔ اسی لیے ان کی مختصر نظم اپنے حجم سے کہیں زیادہ وسیع معنوی امکانات رکھتی ہے۔

میں زندگی کا زخم ہوں
جب بھی کریدو
نظم جنتی ہوں!

شبنم عشائی کی شاعری کی ایک اور اہم خصوصیت خاموش لہجہ ہے۔ ان کے یہاں احتجاج بھی خاموش ہے، محبت بھی خاموش ہے، محرومی بھی خاموش ہے اور تخلیق بھی خاموشی سے جنم لیتی ہے۔ یہ خاموشی کمزوری کی علامت نہیں بلکہ داخلی اعتماد کا اظہار ہے۔ شاعرہ جانتی ہیں کہ گہرا ادبی اثر ہمیشہ بلند آواز سے پیدا نہیں ہوتا۔ بعض اوقات آہستہ کہی ہوئی بات زیادہ دیر تک ذہن میں زندہ رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جذبات کبھی خطابت میں تبدیل نہیں ہوتے۔ وہ قاری کو متاثر کرنے کے لیے جذباتی شدت کا سہارا نہیں لیتیں بلکہ تجربے کی صداقت پر اعتماد کرتی ہیں۔ یہی صداقت ان کی نظموں کو دیرپا بناتی ہے۔ اگر مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شبنم عشائی کی تخلیقی اہمیت کسی ایک موضوع یا ایک فنی تجربے میں نہیں بلکہ اس مربوط شعری نظام میں مضمر ہے جو ان کی تمام نظموں کو باہم مربوط

رکھتا ہے۔ ان کی نظموں میں موضوع بدل سکتا ہے، منظر بدل سکتا ہے، مگر ان کا داخلی آہنگ نہیں بدلتا۔ یہی تسلسل ان کی شعری شخصیت کو استحکام عطا کرتا ہے۔

اسی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شبنم عشائی جدید اردو نظم کی ان آوازوں میں شامل ہیں جنھوں نے باطن کی شاعری کو محض احساس کی سطح سے اٹھا کر شعریات کی سطح پر استوار کیا۔ انھوں نے داخلی تجربے کو علامتی ساخت، خاموش زبان اور مختصر ہیئت کے ذریعے ایک ایسی فنی وحدت عطا کی جس کی مثال معاصر نظم میں کم دکھائی دیتی ہے۔ اس طرح شبنم عشائی کی شاعری کو صرف انفرادی تجربے کی شاعری یا نسائی شاعری کہہ کر محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی اصل شناخت ایک ایسی نظم نگار کی ہے جس نے من، وجود اور خاموشی کو محض موضوع نہیں رہنے دیا بلکہ انہیں جدید اردو نظم کے اندر ایک مکمل تخلیقی اور جمالیاتی نظام میں تبدیل کر دیا۔ یہی ان کی ادبی اہمیت ہے اور یہی ان کے تخلیقی مقام کی بنیاد بھی۔

اب تک کی بحث سے یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ شبنم عشائی کی شاعری کا بنیادی حوالہ "من" ہے، جس کے گرد وجود، تنہائی، تعلق، موت اور تخلیق کے تمام تجربات تشکیل پاتے ہیں۔ تاہم ان کی شعری کائنات کا ایک ایسا پہلو بھی ہے جو ان تمام عناصر کو ایک داخلی وحدت عطا کرتا ہے اور وہ ہے "خاموشی"۔ یہی خاموشی ان کی نظموں کی اصل شعریات ہے۔ ان کی نظموں کو صرف علامتوں، استعاروں یا مختصر بیانیے کے ذریعے نہیں سمجھا جا سکتا، ان کی اصل قوت اس غیر ملفوظ علاقے میں پوشیدہ ہے جہاں لفظ ختم ہوتے ہیں اور معنی اپنی نئی صورت اختیار کرتے ہیں۔ شبنم عشائی کی شاعری میں خاموشی کسی شے کی عدم موجودگی نہیں بلکہ معنی کی ایک فعال صورت ہے۔ وہ ان شاعروں میں شامل ہیں جن کے یہاں غیر کہی ہوئی بات، کہی ہوئی بات سے زیادہ مؤثر ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بہت سی نظمیں اپنے اختتام پر قاری کو کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچاتیں بلکہ ایک ایسے سوال کے ساتھ چھوڑ دیتی ہیں جس کا جواب متن میں نہیں بلکہ قاری کے اپنے باطن میں موجود ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی شاعری کا تعلق اس تخلیقی روایت سے ہے جس میں نظم جواب دینے کے بجائے سوال پیدا کرتی ہے، اور یہی سوال اس کے جمالیاتی حسن کو دوام عطا کرتا ہے۔

شبنم عشائی کی خاموشی دراصل ایک تہذیبی خاموشی بھی ہے۔ جدید انسان جس عہد میں جی رہا ہے، اس میں بولنے کے امکانات بڑھتے جا رہے ہیں لیکن سننے اور سمجھنے کی صلاحیت کم ہوتی جا رہی ہے۔ ہر طرف الفاظ کا ہجوم ہے، مگر معنی کی قلت ہے۔ شبنم عشائی کی نظم اس شور کے مقابل خاموشی کو ایک متبادل جمالیات میں تبدیل کرتی ہے۔ ان کے یہاں خاموشی فرار نہیں بلکہ مزاحمت ہے، ایک ایسی مزاحمت جو بلند آواز میں نہیں بلکہ داخلی استقامت کے ساتھ اپنا وجود قائم رکھتی ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں خاموشی ہمیشہ حرکت کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ یہ ساکت کیفیت نہیں بلکہ ایک داخلی عمل ہے۔ شاعرہ جب کچھ نہیں کہتی تو دراصل وہ قاری کو سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بہت سی نظموں کا سب سے مؤثر حصہ وہ ہوتا ہے جو لکھا نہیں گیا۔ نظم ختم ہونے کے بعد بھی اس کے معنی ختم نہیں ہوتے بلکہ وہاں سے ایک نئی قرأت کا آغاز ہوتا ہے۔

ان کی شاعری میں حذف (Ellipsis) کا عمل محض اسلوبی صنعت نہیں بلکہ شعری فکر کا بنیادی جزو ہے۔ وہ واقعات کو مکمل بیان نہیں کرتیں، کرداروں کی تفصیل نہیں دیتیں، جذبات کی تشریح نہیں کرتیں اور نہ ہی علامتوں کی وضاحت کرتی ہیں۔ اس شعوری اجتناب کے نتیجے میں نظم اپنے اندر ایک ایسا خلا پیدا کرتی ہے جسے قاری اپنی فکری شرکت سے پُر کرتا ہے۔ اس طرح متن اور قاری کے درمیان ایک ایسا مکالمہ قائم ہوتا ہے جو ہر نئی قرأت میں نئے معنی پیدا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شبنم عشائی کی نظموں میں اختتام کا تصور بھی روایتی نہیں۔ اکثر نظموں میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آخری مصرع اختتام نہیں بلکہ آغاز ہے۔ نظم بظاہر ختم ہو جاتی ہے، مگر اس کا داخلی ارتعاش قاری کے ذہن میں جاری رہتا ہے۔ یہی داخلی ارتعاش ان کی شاعری کی اصل جمالیات ہے۔

ان کی خاموشی کا دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ وہ جذبات کی شدت کو آواز کی شدت میں تبدیل نہیں ہونے دیتیں۔ ان کی شاعری میں دکھ ہے، لیکن ماتم نہیں، احتجاج ہے مگر خطابت نہیں، محبت ہے مگر جذباتی وفور نہیں۔ یہ ضبط ان کی شاعری کو ایک غیر معمولی وقار عطا کرتا ہے۔ وہ اپنے داخلی کرب کو اس طرح نظم میں منتقل کرتی ہیں کہ قاری اس کی شدت کو محسوس تو کرتا ہے، لیکن شاعرہ کبھی اپنے احساسات کا تماشہ نہیں بناتیں۔

یہ رویہ ان کی زبان پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ ان کے یہاں لفظ ہمیشہ اپنے ظاہری معنی سے زیادہ اپنے داخلی امکان کے سبب اہم ہوتے ہیں۔ ہر لفظ اپنے گرد ایک خاموش دائرہ قائم کرتا ہے اور یہی خاموش دائرہ اس کے معنوی افق کو وسیع کرتا ہے۔ اس لیے شبنم عشائی کی شاعری میں زبان ابلاغ کا ذریعہ ہونے سے پہلے دریافت کا وسیلہ بن جاتی ہے۔

اسی تناظر میں دیکھا جائے تو ان کی مختصر نظم دراصل ایک مکمل شعری نظام کا خلاصہ ہوتی ہے۔ چند مصرعوں میں وہ جو خلا پیدا کرتی ہیں، وہی خلا قاری کو متن کے اندر داخل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم کو صرف پڑھ لینا کافی نہیں؛ اس کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ ہر نئی قرأت میں لفظوں کے درمیان موجود خاموشی ایک نئی معنوی جہت اختیار کر لیتی ہے۔

اے کاغذ
یوں بے حس
گونگی آنکھ سے
مجھے نہ دیکھ
تیرے سنسان جسم میں
لفظ کے گھنگرو
دھمکنے والے ہیں
قلم کے پیر و بھاری ہیں

شبنم عشائی کی شاعری کی ایک اور نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ خاموشی کو عدمِ اظہار نہیں بناتیں بلکہ اظہار کی اعلیٰ ترین صورت میں تبدیل کر دیتی ہیں۔ ان کے یہاں خاموشی شکست نہیں بلکہ شعور ہے، تنہائی نہیں بلکہ باطنی بیداری ہے؛ اختتام نہیں بلکہ ایک نئی تخلیقی ابتدا ہے۔ اسی لیے ان کی شاعری میں خاموشی ہمیشہ تخلیق کے ساتھ جڑی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ بھی اہم ہے کہ ان کے یہاں خاموشی صرف فرد کا تجربہ نہیں رہتی بلکہ اجتماعی تہذیبی احساس میں بدل جاتی ہے۔ جدید انسان کی سب سے بڑی مشکل یہی ہے کہ وہ اپنے ہی وجود کی آواز سننے سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ شبنم عشائی کی

نظم اس کھوئی ہوئی داخلی آواز کو دوبارہ دریافت کرنے کی کوشش معلوم ہوتی ہے۔ ان کی شاعری قاری کو بیرونی دنیا سے زیادہ اپنے باطن کی طرف متوجہ کرتی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی فکری کامیابی ہے۔

اپنے چہرے میں
مجھ کو ڈھونڈوں
اور نہ ملوں
گمشدگی ہے میری
کہ وجود کا بے اجالا ہے
یا بہہ گئی ہوں
ناتواں چہروں کی دراڑوں میں
ذرا دھوپ لوبان اگربتی بجھا دو
گوچی ارمانی اور پراڈا کی شیشیاں توڑ دو
مجھے میری مہک سونگھنے دو
خود کی خوشبو میں مہکوں تو شاید
خود کی خود سے ملاقات ہو

اس اعتبار سے شبنم عشائی کی نظموں کی شعریات کو تین بنیادی دائروں میں سمجھا جا سکتا ہے: من، وجود اور خاموشی۔ "من" داخلی مرکز ہے، "وجود" اس مرکز کا تجربہ ہے اور "خاموشی" ان دونوں کے درمیان معنی پیدا کرنے والا جمالیاتی وسیلہ۔ یہی تینوں عناصر ان کی پوری شعری دنیا کو ایک مربوط تخلیقی وحدت عطا کرتے ہیں۔

شبنم عشائی کی شاعری کا سب سے نمایاں وصف یہ ہے کہ اس میں علامت کبھی آرائشی وسیلہ نہیں بنتی۔ ان کے یہاں استعارہ اور علامت محض شعری حسن پیدا کرنے کے لیے استعمال نہیں ہوتے بلکہ وہ فکر کی تشکیل کرتے ہیں۔ ان کی ہر علامت اپنے گرد ایک مکمل معنوی نظام قائم کرتی ہے۔ من،

مٹی، تنہائی، خاموشی، لفظ، روشنائی، گرد، فائل، پھلن، غبارہ اور چشمہ جیسے الفاظ اگر الگ الگ دیکھے جائیں تو معمولی محسوس ہوتے ہیں، لیکن ان کی نظموں میں یہی الفاظ ایک دوسرے سے مربوط ہو کر ایسا علامتی جال تشکیل دیتے ہیں جس کے بغیر ان کی شعری دنیا کی تعبیر ممکن نہیں رہتی۔

خاص طور پر ”من“ کی علامت ان کی شاعری کی بنیادی تخلیقی دریافت ہے۔ اردو نظم میں دل، روح، باطن، ذات اور وجود کی متعدد علامتیں پہلے بھی استعمال ہوتی رہی ہیں، لیکن شبنم عشائی نے ”من“ کو جس مسلسل تخلیقی وسعت کے ساتھ برتا ہے، وہ اسے ان کی ذاتی شعری شناخت میں تبدیل کر دیتا ہے۔ ان کے یہاں ”من“ جامد استعارہ نہیں بلکہ مسلسل تغیر پذیر علامت ہے۔ ہر نظم میں اس کی نئی جہت سامنے آتی ہے۔ کبھی یہی ’من‘ تخلیق کی زمین بنتا ہے، کبھی محبت کا مسکن، کبھی دکھ کا گھر، کبھی یاد کا صحرا، کبھی خاموشی کا آنگن اور کبھی وجود کی آخری پناہ گاہ۔ یہی تسلسل ان کی شاعری کو انتشار سے محفوظ رکھتا ہے۔ بہت سے شاعروں کی نظموں میں علامتیں ایک دوسرے سے بے تعلق رہتی ہیں، لیکن شبنم عشائی کے یہاں ہر علامت دوسری علامت سے ربط رکھتی ہے۔ اس طرح ان کی پوری شاعری ایک مربوط علامتی نظام میں ڈھل جاتی ہے۔ یہی ربط ان کی تخلیقی شخصیت کو منفرد بناتا ہے۔

ان کی شاعری کا دوسرا بڑا امتیاز اختصار کی جمالیات ہے۔ مختصر نظم لکھنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے، لیکن چند مصرعوں میں ایک مکمل فکری اور جمالیاتی تجربہ سمیٹ دینا غیر معمولی تخلیقی صلاحیت کا تقاضا کرتا ہے۔ شبنم عشائی نے اس مشکل فن کو اپنی پہچان بنا لیا ہے۔ ان کی مختصر نظم محض ایک خیال یا تاثر نہیں بلکہ ایک مکمل داخلی کائنات ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظم کا اصل حجم اس کے الفاظ میں نہیں بلکہ اس کے معنی میں پوشیدہ ہوتا ہے۔

اسی طرح ان کی شاعری کا ایک اہم امتیاز خاموشی کی تخلیقی معنویت ہے۔ انھوں نے خاموشی کو عدمِ اظہار کے معنی میں استعمال نہیں کیا بلکہ اسے اظہار کی اعلیٰ صورت بنا دیا۔ ان کی نظموں میں حذف، توقف اور غیر ملفوظ حصے اتنی ہی اہمیت رکھتے ہیں جتنی کہ لکھے ہوئے الفاظ۔ قاری جب نظم پڑھتا ہے تو اسے صرف الفاظ سے نہیں بلکہ ان خاموش وقفوں سے بھی مکالمہ کرنا پڑتا ہے جو نظم کے اندر پوشیدہ ہیں۔

یہی خاموشی ان کی شاعری کو وقار عطا کرتی ہے۔ ان کے یہاں جذبات کی شدت کبھی خطابت میں تبدیل نہیں ہوتی۔ وہ اپنے کرب کو آواز نہیں بناتیں بلکہ آہستہ آہستہ معنی میں تحلیل کر دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کا اثر فوری نہیں بلکہ تدریجی ہے۔ پہلی قرأت میں جو بات صرف ایک احساس معلوم ہوتی ہے، دوسری اور تیسری قرأت میں وہ ایک گہری فکری جہت اختیار کر لیتی ہے۔

شبنم عشائی کی شاعری کا ایک اور اہم امتیاز یہ ہے کہ وہ قاری کو سہولت فراہم نہیں کرتیں۔ ان کی نظمیں قاری سے فکری شرکت کا مطالبہ کرتی ہیں۔ وہ معنی کو مکمل طور پر بیان نہیں کرتیں بلکہ اس کا ایک حصہ قاری کی قرأت کے لیے محفوظ رکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظموں کی تعبیر ہمیشہ متحرک رہتی ہے۔ ہر سنجیدہ قاری اپنی داخلی بصیرت کے مطابق ان میں نئے معنی دریافت کر سکتا ہے۔ اسی تناظر میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ شبنم عشائی کی شاعری جدید اردو نظم میں اس تخلیقی روایت کی نمائندہ ہے جس میں نظم کسی واقعے کی روداد نہیں بلکہ شعور کی تشکیل کا عمل بن جاتی ہے۔ ان کی نظموں کا مطالعہ قاری کو صرف شاعرہ کے تجربے سے آشنا نہیں کرتا بلکہ اسے اپنے ہی وجود کے بارے میں نئے سوالات سے بھی روبرو کرتا ہے۔ یہی کسی پائیدار شاعری کی اصل شناخت ہوتی ہے۔

شبنم عشائی کی نظموں کے اس تفصیلی مطالعے کے بعد یہ بات اعتماد کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ ان کی شاعری اپنی اصل میں ایک داخلی شعری نظام (Inner Poetic System) کی تشکیل کرتی ہے۔ ان کی نظموں کی قوت کسی ایک کامیاب نظم، کسی منفرد علامت یا کسی چونکا دینے والے استعارے میں نہیں، بلکہ اس تخلیقی وحدت میں ہے جو ان کے مجموعہ کلام کو ایک مربوط فکری اور جمالیاتی اکائی میں بدل دیتی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو کسی شاعر کی انفرادی شناخت قائم کرتی ہے۔

شبنم عشائی کی نظموں میں موضوعات کی کثرت دکھائی دیتی ہے، لیکن ان موضوعات کی تہہ میں اترنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ایک ہی بنیادی سوال کی مختلف صورتیں ہیں: انسان اپنے وجود کو کس طرح محفوظ رکھے؟ یہی سوال کبھی "من" کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، کبھی تنہائی، کبھی تعلق، کبھی خاموشی، کبھی تخلیق اور کبھی موت کی علامت میں۔ اس طرح ان کی شاعری مختلف موضوعات کے باوجود ایک ہی فکری مرکز سے وابستہ رہتی ہے۔

ان کی نظموں کا ایک اہم وصف یہ بھی ہے کہ وہ داخلی تجربے کو شخصی حدود میں قید نہیں ہونے دیتیں۔ بظاہر نظم ایک فرد کی واردات معلوم ہوتی ہے، لیکن اس کی معنوی ساخت جلد ہی اسے ایک اجتماعی انسانی تجربے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ یہی آفاقیت ان کی شاعری کو ذاتی اعتراف سے الگ کرتی ہے۔ ان کا دکھ صرف شاعرہ کا دکھ نہیں رہتا، بلکہ ہر اس شخص کی داخلی کیفیت بن جاتا ہے جو اپنی شناخت، اپنے تعلقات اور اپنے وجود کے معنی تلاش کرنے کی جدوجہد میں مصروف ہے۔

اسی طرح ان کے یہاں نسائی شعور بھی ایک متوازن صورت میں سامنے آتا ہے۔ عورت کا تجربہ ان کی شاعری میں ضرور موجود ہے، مگر وہ اسے نظریاتی نعرے میں تبدیل نہیں کرتیں۔ ان کے یہاں اصل مسئلہ صنف سے زیادہ انسانی حیثیت کا ہے۔ اسی لیے ان کی نظموں میں عورت کی آواز بھی آخر کار انسان کی آواز بن جاتی ہے۔ یہی اعتدال ان کی شاعری کو وقتی ادبی مباحث سے بلند کر کے دیرپا ادبی تجربے میں بدل دیتا ہے۔

ان کی زبان کا سب سے بڑا وصف اس کی شفاف سادگی ہے۔ یہ سادگی سطحی نہیں بلکہ تخلیقی ہے۔ شبنم عشائی مشکل الفاظ، ثقیل تراکیب یا مصنوعی لسانی آرائش کے ذریعے اثر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتیں۔ وہ عام الفاظ کو اس طرح نئے سیاق میں رکھتی ہیں کہ وہ اپنی لغوی حدود سے نکل کر علامتی وجود اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کی زبان کی اصل طاقت اس کے ذخیرہ الفاظ میں نہیں بلکہ ان الفاظ کے باہمی ربط میں مضمر ہے۔ یہ بھی ان کی شاعری کا ایک اہم امتیاز ہے کہ وہ نظم کو مکمل معنی کے ساتھ قاری کے حوالے نہیں کرتیں۔ ان کے متن میں ہمیشہ ایک ایسا خلا باقی رہتا ہے جسے قاری اپنی فکری شرکت سے پُر کرتا ہے۔ اس اعتبار سے ان کی نظم ایک بند متن نہیں بلکہ ایک مکالماتی متن ہے۔ ہر نئی قرأت اس کے معنی کو وسعت دیتی ہے اور ہر قاری اس سے ایک مختلف معنوی رشتہ قائم کرتا ہے۔ یہی خصوصیت ان کی نظموں کو بار بار پڑھے جانے کے قابل بناتی ہے۔

تاہم ایک متوازن تنقیدی مطالعہ یہ بھی تقاضا کرتا ہے کہ ان کی شاعری کے بعض فنی حدود کی طرف بھی اشارہ کیا جائے۔ ان کی علامتی ساخت اور شعوری اختصار بعض اوقات ایسے قاری کے لیے دشواری پیدا کر سکتے ہیں جو نظم سے فوری مفہوم یا واضح بیانیہ چاہتا ہو۔ بعض نظموں میں ابہام اتنا گہرا ہو

جاتا ہے کہ معنی تک پہنچنے کے لیے متعدد قرأتیں درکار ہوتی ہیں۔ لیکن یہ دشواری دراصل ان کی شعری حکمتِ عملی کا حصہ ہے، اس لیے اسے محض کمزوری قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے باوجود اگر آئندہ تخلیقی سفر میں کہیں کہیں علامت اور داخلی اشارے کے ساتھ خارجی تجربے کی کچھ مزید جہتیں بھی شامل ہوں تو ان کی شعری دنیا کا دائرہ مزید وسیع ہو سکتا ہے۔

شبنم عشائی کی نظموں میں ایک اور قابلِ توجہ پہلو یہ ہے کہ انھوں نے مختصر نظم کو صرف فنی تجربہ نہیں رہنے دیا بلکہ اسے فکری اظہار کی مکمل صورت بنا دیا۔ ان کی مختصر نظمیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ شعری عظمت کا انحصار حجم پر نہیں بلکہ معنوی کثافت پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی چند سطریں بھی قاری کے ذہن میں ایک طویل داخلی مکالمہ پیدا کر دیتی ہیں۔

اس پورے مطالعے کا سب سے اہم نتیجہ یہ ہے کہ شبنم عشائی کی شاعری کو کسی ایک تنقیدی اصطلاح کے ذریعے مکمل طور پر بیان نہیں کیا جا سکتا۔ یہ شاعری علامت بھی ہے، وجود بھی، خاموشی بھی، تخلیق بھی، اور ان سب کے درمیان ایک ایسا داخلی سفر بھی ہے جو انسان کو اپنے باطن سے آشنا کرتا ہے۔ یہی اس کی سب سے بڑی تخلیقی کامیابی ہے۔ اگر جدید اردو نظم کی ان آوازوں کا انتخاب کیا جائے جنھوں نے داخلی تجربے کو علامتی ساخت، اختصار کو معنوی وسعت اور خاموشی کو جمالیاتی اظہار میں تبدیل کیا، تو شبنم عشائی کا نام یقیناً قابلِ ذکر ہوگا۔ ان کی شاعری یہ احساس دلاتی ہے کہ ادب کا اصل کام زندگی کے جوابات دینا نہیں بلکہ اس کے بنیادی سوالات کو زیادہ گہرائی کے ساتھ دریافت کرنا ہے۔ اسی لیے شبنم عشائی کی نظموں کی اصل اہمیت ان کے موضوعات میں نہیں بلکہ ان کے تخلیقی رویّے میں مضمر ہے۔ انھوں نے اپنے باطن کی آواز کو اس طرح نظم میں منتقل کیا ہے کہ وہ فرد کی حدود سے نکل کر انسانی وجود کے مشترک تجربے کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ ان کی نظمیں قاری کو محض متاثر نہیں کرتیں بلکہ اسے اپنے ہی وجود کے ساتھ ایک نئے مکالمے پر آمادہ کرتی ہیں، اور یہی وہ مقام ہے جہاں ان کی شاعری اپنی حقیقی ادبی قدر حاصل کرتی ہے۔

آخر میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ شبنم عشائی کی نظموں کی اصل شعری شناخت تین بنیادی دائروں میں سمٹ آتی ہے۔ من، وجود اور خاموشی۔ یہی تینوں عناصر ان کی شعری کائنات کی فکری بنیاد،

جمالیاتی ساخت اور تخلیقی انفراد کو تشکیل دیتے ہیں۔ ان کی نظموں کا باطن انہی دائروں کے درمیان مسلسل حرکت کرتا ہے اور یہی حرکت ان کی شاعری کو زندہ، متحرک اور بار بار پڑھے جانے کے قابل بناتی ہے۔

Umar Farhat is an Urdu poet, novelist, critic, and editor. In 2012, under the guidance of Shamsur Rahman Faruqi, he founded the quarterly literary journal, *Tafheem*. His books include the novel *Nirakar* (2011); poetry collections *Zameen Zaad* (2019), which won the Sahitya Akademi Yuva Puraskar in 2021, *Sir-e-Shaakh-e-Tamanna* (2021), and *Lafzon ka Chirag*; and the edited volume *Gopi Chand Narang: Alif Aasaar Fikr Paima Naqqad* (2023). His other editorial project, *Khalid Jawed: Fiction Ka Naya Istiyara*, and poetry collection *Wajd Wajood* are forthcoming.